

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_226598

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No.

18139

Accession No. 15821

Author

مفتی علی گیسو
مفتی محمد علی گیسو

Title

This book should be returned on or before the date last marked below

مہاتما گاندھی کی وصیت

لیکھک

منظر علی سوختہ

چھپوانے والے

سکرٹیری ہندوستانی کلچر سوسائٹی

۴۸ بانی کا باغ، الہ آباد

[قیمت دو روپیہ]

سنہ ۱۹۴۹

پہلی بار]

چھاپنے والے۔ حافظ محمد سلیم، سلیبی برقی پریس، یحییٰ پور الہ آباد

دوشبہ

انڈین نیشنل کانگریس نے پچھلے پونٹھ برس میں اس دیش کی بوزبردست یوا کی سہ لے اتھاس کبھی بھلا نہیں سکتا۔ ایک بہت بڑے درجے تک کانگریس نے ہی اس دیش کو جگایا، لاکھوں اور کروڑوں جنٹا میں سنگٹھن اور قربانی کا مادہ پیدا کیا اور آخر میں دیش کو انگریزی راج کی غلامی سے آزاد کیا۔

پر جس طرح سے اچھے سے اچھے آدمی بھی پیدا ہوتے ہیں، بڑے ہوتے ہیں، بڑے بڑے کام کرتے ہیں، بوڑھے ہوتے ہیں، کمزور ہوتے ہیں، بیمار پڑتے ہیں اور پھر دنیا سے چل دیتے ہیں، ٹھیک یہی حالت دنیا کی اچھی سے اچھی قوموں، سمیر دایوں اور سنتھاؤں کی ہوتی ہے۔ کسی بھی سنتھا میں سے کے ساتھ کمزوری اور بیماری کا آنا ایک قدرتی چیز ہے۔ ایسا ہونے پر اچھی سے اچھی سنتھاؤں کو سدھارنے، بدلنے، نیا روپ دینے یا ختم کرنے تک کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

اسی اصول کے او سارا انڈین نیشنل کانگریس میں بھی کچھ بڑے سے بڑے، نیک سے نیک اور اونچے سے اونچے دیش بھکتوں کے ہوتے ہوئے بھی پچھلے کچھ برسوں سے کمزوریاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ ملک کے انگریزی راج سے آزاد ہو جانے اور کانگریس کے ہاتھ میں حکومت آ جانے کے بعد سے یہ کمزوریاں بہت زیادہ چکنے لگیں اور تیزی کے ساتھ بڑھنے لگیں۔

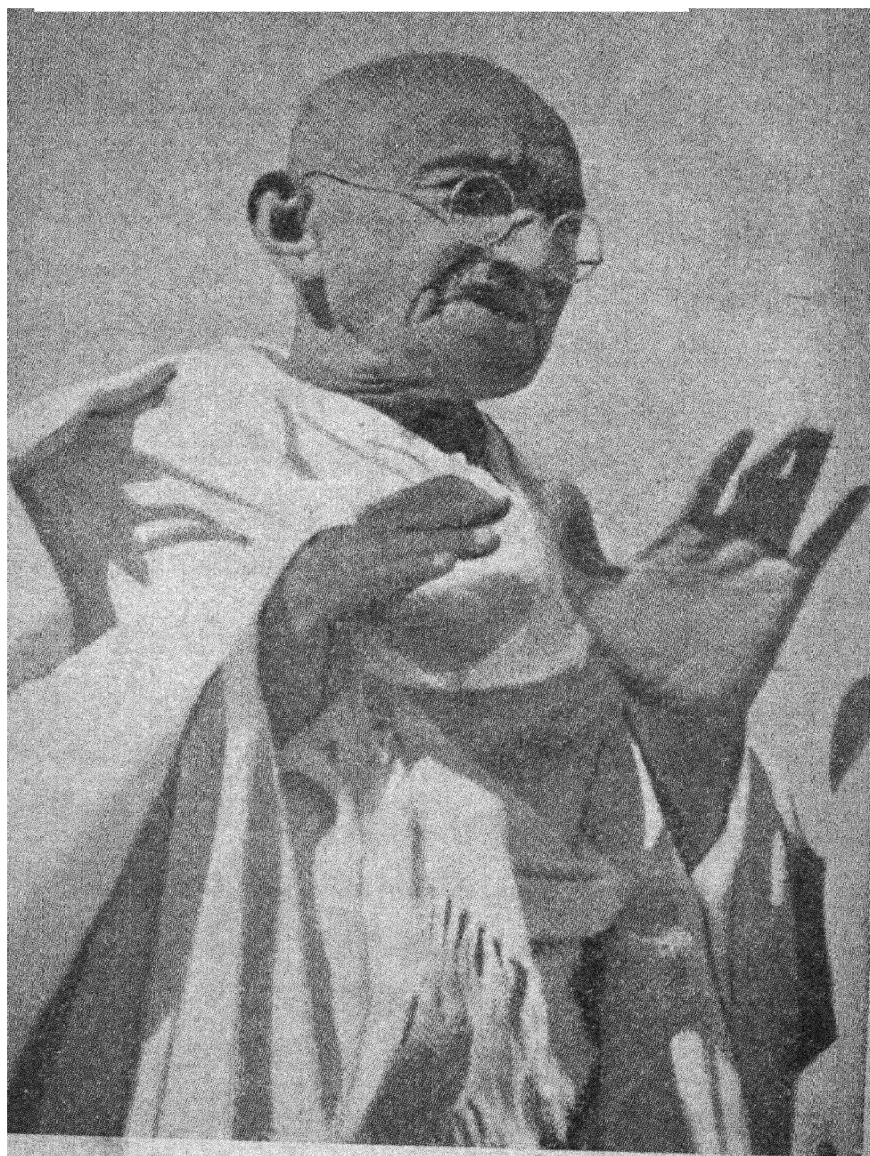
ہاتما گاندھی جی اس دیش کی آتما تھے۔ کانگریس کے ساتھ تو ان کا گہرے سے گہرا ناتھا تھا۔ کبھی کبھی تو بالکل ایسا لگتا تھا کہ گاندھی جی ہی کانگریس ہیں اور کانگریس ہی ہاتما گاندھی ہے۔ وہ دیش کی ضرورتوں کو بھی اچھی طرح جاننے پہنچتے تھے۔ کانگریس کی اس گرتی ہوئی حالت کو بھی وہ اچھی طرح دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔

اس کے علاج کی بھی اُنھیں سب سے ادھک چنتا تھی۔ آخری برسوں میں اُنھوں نے کانگریس کے دوسرے بیناؤں اور سیدکوں کے ساتھ اس بارے میں انیک بار چرچا کی۔ اُن کی نبض دیش کی نبض کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ اپنے دل کے مات شفاف شیشے میں وہ دیش کے روپ کو ٹھیک ٹھیک دیکھتے تھے۔ اپنی اچانک موت کے کارن وہ دیش اور کانگریس کے اس روگ کا علاج اپنے ڈھنگ سے نہ کر پائے۔ ہمارے لئے اور دیش کے لئے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ گاندھی جی نے کانگریس کے اس روگ کا کیا علاج سوچا تھا۔

۲۹ جنوری سنہ ۱۹۴۸ء کو اُنھوں نے ”لوک سیوک سنگھ“ کا ایک نیا چھوٹا سا دھان تیار کیا۔ اگلے دن دوپہر کے بعد اُنھوں نے یہ دھان کانگریس کے جنرل سکرٹری کو بلا کر اُس کے سپرد کیا اور کہا کہ یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے گاندھی جی کی طرف سے اُن کے سمجھاؤ کے روپ میں پیش کیا جائے۔ یہ ہو سکے چند گھنٹے کے بعد ہی گاندھی جی چل بسے۔ یہ دھان ۱۵ فروری سنہ ۱۹۴۸ء کے ’ہترجین‘ میں چھپا ہے۔ کانگریس اور دیش کے نام بالو کی یہ آخری وصیت ہے۔ دھان خود بہت چھوٹا سا ہے پر ہر دیش واسی کیلئے اس کا جانا اور سمجھنا ضروری ہے۔ اس پُستک میں گاندھی جی کی یہ آخری وصیت اُن کے پُر بھکت شری منظر علی سوختہ کی پوری پوری دیا لکھیا کے ساتھ دی جا رہی ہے۔ آشا ہے کہ ٹھنڈے دل سے دیش کی بھلائی سوچنے والے بہت سے بھائی بہنوں کو اپنا اگے کا راستہ طے کرنے میں اس سے بہت بڑی مدد ملے گی۔

سند راقل

نئی دہلی
۱۷ اگست سنہ ۱۹۴۹ء



चापू २५५

باپو کے بنیادی سہانت

ہم اتنا گاندھی کے ”لوک سیوک سنگھ“ کے اس نئے دھان کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ہم اُن بنیادی سہانتوں کو سمجھ لیں جن پر باپو انسانی سماج کو ڈھاننا چاہتے تھے۔ ہم یہاں اُن کے گہرے ادھیاتک یا روحانی دھاروں اور آدرشوں میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ باپو اس دنیا میں ہمارے سماج کو کیا روپ دینا چاہتے تھے۔ باپو کا لوک سیوک سنگھ اسی دنیا کے لئے ہی اور اسی دنیا میں لوگوں کے سچے سکھ اور سچی سہانتی سے اس کا سمبندھ ہے۔ تختہ پلے سے تبدیلی میں باپو کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں سہیتا اور ہمیں سمارج داد کے ظلموں اور اترتوں سے اپنے دیش کو اور دنیا کو کیسے بچایا جاسکے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سہیتہ اور اہمنا کے ہتھیاروں سے ہی ہمیں سہیتا کو جیتا جاسکتا ہے۔ اسی لئے ان ہتھیاروں سے کام لینا اپنے دیش والوں کو سکھانا ہی اُنہوں نے اپنے جیون کا خاص مقصد بنا لیا تھا۔ اگر ہم باپو کے جیون کے اس پہلو کو ابھی طرح سمجھ لیں تو اُن کا یہ دھان

بھی ہماری سمجھ میں آ جاوے گا۔ اسی لئے ودھان کے دینے سے پہلے ہم گاندھی جی کے موٹے موٹے اصولوں، اُن کے دھرم یعنی سستیہ اور اہنسا اور کچھی سبھیتا کے بارے میں اُن کے وچار، یہ سب بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم اُن کے دھرم کو ہی لیتے ہیں۔

ہزاروں برس پہلے پورب کی سبھیتا نے دنیا کو دین دھرم کی ٹھوس بنیادوں پر قائم کیا تھا اور آدمی کی زندگی کو دین دھرم کے سانچے میں ہی ڈھانا چاہا تھا۔ آج کل کی کچھی سبھیتا نے انسانی سماج کی اُن پرانی بنیادوں کو جڑ سے ہلا دیا ہے۔ آج دنیا کے ۹۵ فی صدی پڑھے لکھے لوگ دھرم کے اُن سیدھے سادے اصولوں کو بھی، جن کا نیکی بدی سے سمبندھ ہے، جیسے سچ بولنا، چوری نہ کرنا، دوسروں کے ساتھ ایمانداری برتنا، جنھیں پرانی دنیا کے لوگ اُٹل مانتے تھے، فضول اور نکمٹا سمجھتے ہیں اور ان پر عمل کرنے والوں کو پاگل اور دقیانوسی کہتے ہیں۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے آدھیاत्मک یا روحانی باتوں کو سمجھنے کے لئے اور نیکی بدی کے اصولوں کی اصلیت جاننے کے لئے بھی کسی طرح کی تعلیم یا تجربے کی ضرورت ہے۔ یہ سب سسے کا پھیر ہے۔ اس کا کوئی جھٹ پٹ علاج ہو بھی نہیں سکتا۔ بڑے بڑے انقلابوں کے دنوں میں اس طرح کی کٹھنایاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کٹھنایاں ہی بڑھ کر انسانی سماج کی بڑی بڑی مصیبتوں کا کارن بن جاتی ہیں۔

باپو اسی طرح کے ایک بہت بڑے اُٹ پھیر کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ پرانی سبھیتاؤں کے دھرم اور نیکی بدی کے وچار ملتے جا رہے تھے۔ یورپ کے بڑھتے ہوئے تجارتی اور راج کاجی طوفان اور کچھی سماراج نے ان پرانی سبھیتاؤں کے اس طرح کے

دھاروں اور آدرشوں کو نکلتا، پھیکا اور بے جان کر دیا تھا۔ گاندھی جی کی آتما اس دیش کی پُرانی سمجھتا کے رنگ میں گہری رنگی ہوئی تھی۔ دنیا بھر کے اندر ایک طرف دین اور دوسری طرف دنیا کا موہ جال یا ایک طرف نیکی اور ہدی کا خیال اور دوسری طرف دنیا پرستی، ان کے پنج کھینچا تانی جاری تھی۔ زمانے نے زبردستی مہاتما گاندھی کو اس مہاسنگرام کے میدان میں دھرم اور نیکی کی طرف ایک مہارتھی کے روپ میں لا کر کھڑا کر دیا۔ دیوتاؤں اور آئسروں یا دھرم اور ادھرم کے پنج کا یہ سنگرام ابھی تک جاری ہے۔

گاندھی جی اپنے ساتھ دو بنیادی خیال دنیا میں لائے۔ اُس سے کی دنیا کے لئے یہ دونوں بالکل انفکھے تھے۔ ایک یہ کہ آتم بل یعنی روحانی طاقت ایک بہت بڑی طاقت ہے اور دنیا کی اور سب طاقتیں مل کر بھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ دوسرا یہ کہ یہ آتم بل عام لوگوں میں بھی پیدا کیا جاسکتا ہے اور اس کی مدد سے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں، اُن کے ظلموں اور حکومتوں کا اہنسا کے اصول پر چل کر مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ طاقتیں چاہے دیش کے اندر کی ہوں چاہے باہر کی، چاہے راج کا جی ہوں چاہے سامبر داگ۔

دھرم کا اصلی روپ

گاندھی جی کے سامنے ایک بڑی کٹھنائی یہ بھی تھی کہ دھرم کا جو روپ اُن کے سامنے تھا اور جو دنیا کی سب دھرم پشتکوں میں اصلی دھرم بتایا گیا ہے وہ بہت کچھ بگڑ چکا تھا۔ دین دھرم اپنی پُرانی جگہ

کھوچکا تھا۔ دھرم پستکوں کا وہ مان نہ رہ گیا تھا۔ کھوکھلے ریت
رواجوں اور پرہنجوں کو ہی لوگ دین دھرم سمجھ بیٹھے تھے۔ اسی
لئے بہت سے سمجھ دار لوگ دھرم سے دور بھاگتے تھے۔ گاندھی جی
دھرم کا سامراج اُس کے اصلی روپ میں راج کاج کے اوپر اور
انسانی زندگی کے سب پہلوؤں پر جانا چاہتے تھے۔
دھرم کے اس اصلی روپ کی جو دیکھیا مہا بھارت میں کی گئی ہے
اُسے ہم نیچے دیتے ہیں۔

جاجلی نے رشی سے پوچھا ”دھرم کیا چیز ہے؟“ جاجلی نے جواب
دیا۔ ’دھرم‘ شبد ’دھری‘ دھاتو سے نکلا ہے جس کا مطلب سنبھالے
رکھنا یا ملائے رکھنا ہے۔ دھرم سے سارا انسانی سماج سنبھلا ہوا ہے۔
جو چیز سب کو سنبھالے اور ملائے رکھے اُسی کو پکی طرح دھرم سمجھو۔
کسی جاندار کو دکھ نہ پہنچے اُس کے لئے دھرم کا بکھان کیا گیا ہے۔
جس چیز سے کسی کو بھی دکھ نہ پہنچے اسی کو دھرم جانو۔ سب جان
داروں کے بھلے کے لئے دھرم کا بکھان کیا گیا ہے، جس چیز سے سب
کا بھلا ہو اسی کو پکا دھرم جانو۔ ہے جاجلی ! جو آدمی ہمیشہ دل
سے سب کا بھلا چاہتا ہو اور اپنے کاموں سے، من سے، اور دھن
سے سدا سب کا بھلا کرنے میں لگا رہتا ہو وہی دھرم کا جاننے والا ہے۔
منوسمرتی میں منو ہماراج نے سب آدمیوں کے لئے، چاہے وہ
کسی جس دیش، جاتی یا ورن کے ہوں، دھرم کی دس پہچانیں بتائی ہیں۔
دھرم کی وہ دس پہچانیں یہ ہیں۔ —

”دھیرج رکھنا، یعنی صبر کرنا، کشنا یعنی سب کو معاف کر دینا، دم
یعنی اپنی آتما پر قابو، چوری نہ کرنا، صفائی، اپنی اندریوں یعنی نفس

پر قابو، بدھی یعنی عقل سے کام لینا، ودیا حاصل کرنا، سچائی اور غصّہ نہ کرنا۔

دھرم کے بارے میں اپنی شنکا کو دور کرنے کے لئے جب ہماراج یدھشٹر نے ہرشی دیاس سے پوچھا کہ اصل دھرم کیا ہے تو ہرشی دیاس نے بتایا —

”ہے یدھشٹر! دھیرج، اکشہا، اہنسا، چوری نہ کرنا، صفائی، اندریوں کو بس میں رکھنا، بدھی کو ٹھیک رکھنا، ودیا حاصل کرنا، سچ ہونا اور غصّہ نہ کرنا یہی دھرم کے بچھن ہیں“

باپو اسی سچے دھرم کو دنیا میں پھر سے جگانا اور پھیلانا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے سب ہی مذہبوں کی کتابوں کو جی بھر کے اور پریم کے ساتھ پڑھا تھا۔ سب دھرموں اور سب دھرموں کی کتابوں میں اُنھیں ایک ہی سچائی دیکھنے کو ملی۔ سب مذہبوں کا ایک سا اُدر اور مان اُن کے دل میں پیدا ہو گیا۔ وہ سب مذہبوں میں ایک ہی روشنی اور ایک ہی اصلیت کو دیکھتے تھے۔ سب دھرم پشتوں کو مستحکم اُنھوں نے انسانی زندگی کے دو بنیادی نیم نکالے۔ یہ دونوں نیم تھے، ستیہ اور اہنسا۔ انھیں کو سچائی اور پریم بھی کہا جاسکتا ہے۔

باپو کے لئے دھرم کیوں پڑھ لینے یا کوئی ریت رواج پدی کر لینے کی چیز نہیں تھی۔ اُن کے لئے دھرم زندگی میں ڈھالنے کی چیز تھی۔ رہنے سہنے، کھانے پینے، دوسروں سے برتاؤ کرنے، سب کاموں کو وہ دھرم کی کسوٹی پر کتے تھے اور اپنی زندگی میں دھرم کے اُسی طرح تجربے یا پر یوگ کرتے تھے جس طرح ایک سائنس دان سائنس

کے تجربے کرتا ہے۔ اسی لئے انھیں آدھیا تمک و گیانی یا روحانی سائنس والا کہا جاسکتا ہے۔ دنیا کی ہر دھرم پستک بتاتی ہے کہ دھرم کیوں جاننے ہی کی چیز نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر کام میں، ہر سے اور ہر حالت میں برتنے کی چیز ہے۔ باپو نے اسی کو اپنے جیون کا بنیادی اصول بنا رکھا تھا۔ اس راستے پر چلنے میں انھیں طرح طرح کے انوبھوتے رہتے تھے، جن سے وہ آپ بھی فائدہ اٹھاتے تھے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتے تھے۔ یہی اُن کی زندگی کا مشن تھا۔ دکن افریقہ میں ستیہ اور اہنسا کے تجربوں کا اُن پر بہت گہرا اثر پڑا۔ انھوں نے دھرم پستکوں میں پڑھا تھا کہ سچائی اور اہنسا میں وہ طاقت ہے جس سے ہنسا یا ربار کاٹ کی بڑی سے بڑی طاقتوں کو جیتا جاسکتا ہے۔ باپو نے پہلے تو اپنے نجی جیون میں اس کے تجربے کر کے دیکھے۔ انھیں ان تجربوں میں پوری کامیابی ملی۔ پھر انھوں نے بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر اسی طرح کے تجربے شروع کئے۔ انھوں نے سماج کے دکھ درد کو اسنے میں اور راج کالج کے میدان میں بھی سچائی اور اہنسا کے تجربے کئے۔ تھوڑے دنوں میں انھیں دشواری ہو گیا کہ سچائی اور اہنسا ایسے ہتیار ہیں جو کبھی ناکام نہیں ہو سکتے اور جن سے ہر طرح کے ظلموں، اتیادوں اور انبرتھوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔

دکن افریقہ کی سرکار دہاں کے ہندوستانیوں کے ساتھ بڑے بڑے ظلم کر رہی تھی۔ باپو نے اُن ظلموں کا مقابلہ کرنے کے لئے ستیہ اور اہنسا پر چلتے ہوئے لڑنے کا ایک نیا ڈھنگ نکالا جس کا نام انھوں نے ”ستیاگرہ“ رکھا۔ اس انوکھی لڑائی میں انھیں دہاں کی سرکار کے خلاف ان مہنی کامیابی ملی اور

بہت بڑے پیمانے پر انھوں نے اپنے دیش بھائیوں کے دکھوں کو دور کر دیا۔

دکھنی افریقہ کے تجربوں سے باپو کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ جب تک ہندستان آپ آزاد نہیں ہوتا تب تک باہر کے ملکوں کے ہندوستانیوں کے دکھوں کی جڑ نہیں کٹ سکتی۔ اس لئے اب وہ ستیاگرہ کا سدرشن چکر لئے ہوئے ہندستان لوٹ آئے تو اس وچار سے کہ یہاں کی جتنا کو اس ہتھیار کا استعمال سکھا کر اُسی کے ذریعے اُسے انگریزی راج سے آزاد کریں۔

ہندستان پہنچ کر جب اُنھوں نے یہ اعلان کیا کہ میں اہنسا سے انگریزی راج کو ہٹا دوں گا تو سارے دیش اور خاص کر یہاں کے راج کا جی نیتا دنگ رہ گئے۔ پڑھے لکھے ہندستانی گاندھی جی کی اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ سرکار کی بڑی سی بڑی فوجیں، پولیس اور ساری طاقتیں اہنسا اور آتم بل کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ کسی کو دشوا س نہ ہوتا تھا۔ بات یہ تھی کہ یہ لوگ اپنے دھرم کی کتھاؤں کو کبھی کا بھول چکے تھے اور ہندستانی سبھیتا کی وہ اونچی، آتمک اور روحانی چوٹیاں جن پر یہ دیش کسی سے پہنچ چکا تھا، صدیوں سے ان لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ نہیں تو ہندو شاستران ہتھیاروں کی تعریفوں سے بھرے پڑے ہیں۔ مثال کے لئے ہم گو سوامی تلسی داس جی کی رامائن سے وہ بات جیت نیچے دیتے ہیں جو لنکا کی بڑائی کے پہلے رام چندر جی

اور دی بھیشن میں ہوئی تھی ۔ اس بات چیت میں رتھ کا ایک چتر
کھینچا گیا ہر اور کچھ ہتیار گناے گئے ہیں ۔ یہ سب تلسی داس جی
کے من کی گروہنت نہیں تھی ۔ انھوں نے یہ سب پُرانی دھرم کی
کتاؤں سے لیا تھا ۔ پھر بھی تلسی داس جی کا یہ چتر اتنا سندھ اور
سچا ہر اور گاندھی جی کے ستیا گرہ کا روپ اس میں اتنی اچھی طرح
چمک اُٹھتا ہر کہ دیا اور کہیں نہیں ملتا ۔

دی بھیشن جب راون کو چھوڑ کر رام چندر جی کے پاس آئے تو
انھیں ننگے سر ننگے پیر دیکھ بندروں سے گھرا ہوا دیکھ کر گھبرا کر
رام چندر جی سے کہنے لگے —

راون رتھی بیرتھ رگھو بیرا
دیکھ دی بھیشن بھیسو ادھیرا
ادھک پریتی من بھا سندھیا

بند چرن کہ سہت سینھا
نا تھ نہ رتھ نہیں تنو پد ترانا،

کیہی بیدھی جیتب بیر بلوانا

رام چندر جی نے اس سوال کا دی بھیشن کو یوں جواب دیا —
سُنھوں سکھا کہہ کر پاندھانا،

جیہی جے ہوئی سوسندن آنا

سورج ، دھیرج ، تہی رتھ چاکا،

ستہ شیل ، درڑھ دھو جا پٹاکا

بل دیو یک دم پر ہت گھورے،

چھما ، کر پا سمتا رجو جورے

ایش بھجن بیا رتھی سو جانا،
 ورتی چرم سنسٹوش کہ پانا
 دان، پرسوا، بدھی، شکتی پرچڈا
 ور وگیان کشتن کو دنڈا

اے اہل من ترون سمانا،
 سم، جم، نیم، شیلی کٹھ نانا
 کوچ ابھید وپر گرو پوجنا
 ایہی سم دے ادپاس نہ دوجا
 سکھا دھرم ے اس رتھ جا کے

جیتن کہہ نہ کہتوں ریوتا کے
 دہم۔ ما اے سنار ریو، جیتی سکے سو دیر

جا کے اس رتھ ہوئے ورڈہ، تھوں سکھا متی دھیر

ہم راجندر جی کے ان شبدوں کی اور دیا کھیا کرنا نہیں چاہتے۔
 ہم کیوں اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ انھیں ہتھیاروں کو رانا کہنے،
 انھیں کو گیتانے، انھیں کو ہاتھ لگانا دھی نے اُس رام رادن یاد دہی
 اُس سر سنگرام میں جیتنے کا اموگھ ہتھیار مانا ہی جو سنگرام دنیا میں سدا
 ہوتا رہتا ہی۔ ہماری باہر کی لڑائیاں اسی اندر کی لڑائی کی چھکایا
 ہوتی ہیں۔ اسلئے جن ہتھیاروں سے اندر کی لڑائی جیتی جاسکتی ہو وہی
 اصل اور سچے ہتھیار ہیں اور انھیں سے باہر کی لڑائی بھی جیتی جاسکتی ہو۔
 جن اچھائیوں کو رام چندر جی نے اوپر شکتیوں کے رادپ میں
 گنایا ہو، اُن میں سے کوئی ایسی نہیں جسے ہر آدمی اپنے اندر
 پیدا نہ کر سکے۔ انھیں اپنے اندر پیدا کرنے کا طریقہ اُن پنج سات

برتنوں کو پالتا اور سادھنا ہر جھٹیں سب مذہبوں کی پستکوں میں آتم بل پیدا کرنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ہندو شاستروں میں اس کے لئے یہ پانچ 'مہارت' گناے گئے ہیں۔ — ستیہ، اہنسا، برہمچریہ، استیلا اور اپریگرہ، یعنی سچ بولنا، کسی کو دکھ نہ دینا، نیک چلن رہنا پھری نہ کرنا اور مال جمع نہ کرنا۔

ان پانچ کو ہی اور آسانی کے لئے گاندھی جی نے اپنی کتاب 'منگل پر بھات' میں گیارہ برت بنا دیا ہے۔ ان میں کوئی اونکھی بات نہیں ہے۔ جس طرح دند، بلٹھک، مگدر، جھانی بل پیدا کرنے کے سادھن ہیں دیے ہی یہ برت آتم بل پیدا کرنے کے سادھن ہیں۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ثریہ کو بلوان بنانے کے طریقوں سے آتما کو بلوان بنانے کے طریقے بہت زیادہ کٹھن ہیں۔ پر ایسا ہے نہیں۔ بات یہ ہے کہ اب تک ہم نے اپنی نجی زندگی، گھریلو زندگی اور سماجی زندگی تینوں کو بڑے درجے تک ہنسنا اور ادھرم کے سانچوں میں ڈھال رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی جڑ ہماری چھوٹی چھوٹی خود غرضیوں پر ہے۔ اگر ہم دوسرے سب منشیوں کے ساتھ ایک کلمب کے آدمیوں کا سا برتاؤ کرنے لگیں تو یہ سانچے بھی بدل جاویں اور ہم سب کے لئے آتم بل پیدا کرنے کے طریقے بھی آسان ہو جاویں۔ ہم چاہیں تو یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔

آتم بل

آتم بل پیدا کرنے کے یہ سارے سادھن بہت پڑانے ہیں۔ پڑانے زمانے سے دنیا کے روحانی سائنس دانے یعنی سنت، مہاتما اور اللہ والے

ان سادھنوں کی چھان بین کرتے رہے ہیں اور ان کے اصلی روپ کو سمجھ کر ان سے سب انسانوں کو بہت سے بہت لا بہہ پہنچانے کے طریقے نکالتے رہے ہیں۔ پر ہمارا گاندھی نے جو روپ ان سادھنوں کو دیا ہے اور سارے دیش کو ان کی تعلیم دینے کے جو ڈھنگ نکالے ہیں، جن سے اتنے بڑے پیمانے پر اُنھوں نے راج کالج کی لڑائیاں بھی لڑی ہیں اور اُن میں کامیابی پائی ہے، اس سب کی مثال پورب کی چرائی سمجھتا اور ہماری دھرم کھتاؤں میں بھی نہیں ملتی۔ یہی باپو کا بڑا پن اور انوکھا پن تھا۔ اُنھوں نے اپنے دیش کو سنیاگرہ کی تعلیم دے کر انسانی زندگی میں ایک ایسے نئے رنگ کی بنیاد ڈالی ہے جسے اتھاس ہزاروں سال تک بھی نہیں بھٹلا سکتا۔

گاندھی جی نے اصلی دھرم کو پھر سے زندہ ہی نہیں کیا، اُنھوں نے دھرم کے ادربیک کے خاص خاص سدھانتوں کو پہلے سے کہیں زیادہ اونچا لے جا کر اُن کے پھیلاؤ کو بھی بہت بڑھا دیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر کوئی ہمارے داہنے گال پر چاٹتا رہے تو اتنا ہی کافی نہیں کہ تم اپنا بائیں گال بھی اُس کے سامنے کر دو، بلکہ تمھارا یہ بھی دھرم ہے کہ مارنے والے کی عادت کو بھی خود اہلنا پر قائم رہتے ہوئے ٹھہرا دو۔ اسی طرح اُنھوں نے بتایا کہ چوری کے معاملے میں یہی کافی نہیں ہے کہ چور کو سزا دی جائے، یا اُسے چوری کا سامان لے جائے دیا جائے یا باقی کا مال بھی اُسکی نذر کر دیا جائے، بلکہ اُس کی اس بُرائی کو دور کرنے کے بھی ہر آدمی کو کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

اس سے بھی بڑھ کر باپو کی ایک خاص بات یہ ہے۔ اُنھوں نے سنیاگرہ کو کیوں ایک ایک آدمیوں کے ہی سدھار کا ذریعہ نہ

بنا کر سارے سماج کے سدھار کا بھی سادھن بنا دیا اور اُس کے لئے
 لڑنے اور کام کرنے کے ایسے ڈھنگ نکالے جو بڑی سے بڑی حکومتوں
 کے خلاف کام میں لائے جاسکتے ہیں اور جن سے بڑے بڑے پیمانے پر
 لوگوں کی بھلائی، بڑھوتی اُن کی رکشا اور سماج سدھار سب کام
 لیا جاسکتا ہے۔ اپنے انھیں طریقوں کے تجربے گاندھی جی برابر اپنی اہنسا
 کی لڑائی میں کرتے رہے۔

سوراج

ہم نے گاندھی جی کے دھرم کے بارے میں دچار اور اُنکے ستیہ، اہنسا
 اور ستیاگرہ کا اصلی روپ اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ آگے ہم اُن
 کے اُس سوراج کا روپ درخشا چاہتے ہیں جسے وہ اہنسا کے طریقوں
 سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ باپو سچا سوراج اسے مانتے تھے کہ سماج
 کے اندر سچی آتمکتا یعنی سچی روحانیت اور دھرم کی سچی بھادنا کا ہی
 راج ہو اور اُسی کا بول بالا ہو۔ یعنی یہ کہ سماج کے سارے سمبندھوں
 میں ایک دوسرے کے ساتھ سچائی اور اہنسا کے اصولوں پر ہی عمل
 کیا جادے۔ اگر ہمارے پاس کے سب سمبندھ سچائی اور اہنسا کے اصولوں
 پر ہی قائم ہو جادیں تو ہم میں سے ایک دوسرے کی نفرت، ڈاٹا، دشمنی
 خود غرضی جیسی بُرائیاں سب مٹ جادیں۔ ان بُرائیوں کے مٹ جانے
 پر انسانی سماج کا جو روپ بنے گا اُسی کو ہمارے شاستر نہیں ”دسودھو
 کٹھکم“ یعنی یہ کہ اس دھرتی کے رہنے والے سب لوگ ایک
 کٹھ ہیں، کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ یہی انسانی سماج کے دیکاس کی آخری
 منزل ہے اس آدرش کو صاف صاف روپ دیکر باپو انسانی سماج کو

ایک گٹھ کے سانچے میں ڈھال دینا چاہتے تھے۔ یہی ان کے سوراج کا اصلی رُوتھا۔
 جس طرح باپو کے ہتھیاروں اور سادھنوں کا اصلی روپ درشانے
 کے لئے ہم نے گو سوامی تلسی داس جی کی مدد لی ہو اُسی طرح گاندھی جی
 کے سوراج کا سچا روپ درشانے کے لئے بھی ہم تلسی داس جی سے ہی مدد
 لینا چاہتے ہیں۔ رادن کو جیتنے کے بعد راجندر جی نے جو راج قائم کیا
 اسکا چتر گو سوامی جی نے نیچے کے شبدوں میں کھینچا ہے۔

دوہا — درنا شرم نج نج دھرم، زت دید پتھ لوگ
 چلیں سدا پاو ہیں شکھ نہیں بھے شوک نہ روگ
 جو پائی — دے رک، دے رک، بھو تک تاپا

رام راج نہیں کا ہو ہیں دیا پا
 سب زکر ہیں پرس پر پریتی
 چلیں سو دھرم زت شرتی ریتی
 چار ہو چرن دھرم جگ ما ہیں

پوری رہا سپنے ہوں اکھ نا ہیں
 نام بھگت رت نہ ارد ناری
 سکں پریم گتی کے ادھیکاری
 اپ مرتو نا ہیں کوئی او پسرا

سب سندر سب زج شررا
 نہیں دیدر کو او دکھی نہ دینا
 نہیں کو او ابودھ نہ پھن ہینا
 سب زرد بھہ، دھرم رت پونی
 ز ارد نار چتر سب گوئی

سب گنگیہ پنڈت سب گیانی
 سب کرنگیہ نہیں کپٹ سیانی
 سب اُدار سب پر اُپکاری
 دپر چرن سیوک ز ناری
 ایک ناری درت رت سب جھاری
 تے من دتھ کرم پتی ہتھکاری
 دوا۔۔۔ دتھ بقیہہ کر بھید جنہ، دتھک زرتیہ سماج
 جت ہوں منہی اس سُنئے جگ، راجندر کے راج

باپو رام راج کا نام بہت لیا کرتے تھے۔ رامائن سے انھیں
 اچھا پریم تھا۔ وہ اُسے بار بار سنا کرتے تھے۔ اسلئے بہت ممکن ہے
 کہ جس سوراج کو باپو رام راج بتاتے تھے اُس پر تسی داس جی
 کے اس چتر کی گہری چھاپ ہو۔
 اس میں کوئی عجیب بات بھی نہیں ہے، کیونکہ اگر ہم اس چتر
 میں سے کوئی کے انکاروں کو الگ کر دیں تو اس چتر میں اور
 دنیا کے دوسرے آدرش راج کے اچھے سے اچھے چتروں میں جو کچ
 کل چاہو ہیں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ پر جانتے یعنی جمہوریت کا
 نام رٹنے والے، ایسے ہی سماج دادی یعنی سوشلسٹ اور
 عامیہ دادی یا کمیونسٹ سب کے سب سوراج کو اپنے اپنے ڈھنگ
 سے جو آخری اور سب سے اونچا روپ دیتے ہیں، وہ تسی داس
 جی کے اس چتر سے بہت الگ نہیں ہے۔ یہ سب چتر ایک دوسرے
 سے ملتے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان دونوں طرح کے چتروں میں ایک بڑا فرق بھی ہے۔ کچھ ہی نیتا سوراج کے اپنے سب چتروں میں بھونکتا یعنی مادہ پرستی کو اور باہوئل کو سب سے بڑی جگہ دیتے ہیں۔ وہ باہوئل کو ہی یعنی ہتھیاروں اور جسمانی طاقت کو ہی سراج کی رکشا، اُس کے سدھار اور اس کی ترقی کا سب سے بڑا سادھن بتاتے ہیں۔ دین دھرم یا نیکی بدی اور ایمان داری کی ان کے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ اس کے خلاف باپو دین دھرم اور نیکی بدی پر ہی سارا زور دیتے ہیں۔ رام راج کا جو چتر ہم نے اوپر دیا ہے۔ جسے ہم نے باپو کا سپنا بتلایا ہے اُسے اگر ہم دھیان سے دیکھیں تو اُس میں یہی بات دکھائی دے گی۔ ہم نے جو دس بارہ چوپائیاں چنی ہیں اُن میں دھرم کا اصلی روپ ہی طرح طرح سے دکھایا گیا ہے۔ جیسے —

بچ بچ دھرم رزت
 چلہیں سو دھرم رزت

چاری ہوں چرن دھرم جگ ماہیں،
 سکل پر مگتی کے ادھیکاری،
 نہ بچھن ہینا

..... سب نرد مہم دھرم رت پونی
 سب کر تگیہ نہیں کپٹ سیانی سب پر آپکاری
 ایک ناری رت رت

دھرم کے چار چرن جن کی اوپر بات آئی ہے یہ ہیں۔ دان، تپسیا، گیان اور دیا۔ باپو نے انھیں پر وہ سارے تعمیری کام چلائے،

ہیں جو وہ سسے سسے پر سوراج لینے کے لئے ضروری بتاتے تھے۔ دھرم میں باپو نے ایک بہت بڑی اور معرکے کی چیز اور بڑھائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نیکی کے لئے اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ ہماری نیت ٹھیک ہو اور جس مقصد تک ہم پہنچنا چاہتے ہیں وہ پاک اور اچھا ہو، یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ جن طریقوں اور مادہوں سے ہم اس لکش تک پہنچنے کی کوشش کریں وہ طریقے اور مادہ بھی شدھ اور پاک ہوں۔ باپو کا کہنا تھا کہ ناپاک مادہ آدمی کی نیت اور لکش دونوں کو ناپاک بنا دیتے ہیں۔ اس لئے کوئی ناپاک یا گرا ہوا مادہ جلدی میں یا عملی نگاہ سے کتنا ہی کام کا کیوں نہ معلوم ہوتا ہو انت میں وہ ہمیں نقصان ہی پہنچا دے گا۔

ستیہ اور اہنسا

باپو نے سچائی اور اہنسا کو سدا چار کا بنیادی اصول مان لیا تھا۔ اسلئے انھوں نے اس پر زور دیا کہ ہمارے کام کرنے کے سب ڈھنگ اور مادہ بھی ستیہ اور اہنسا کی کسوٹی پر کھرے اُترنے چاہئیں۔ باپو اسے بہت ضروری سمجھتے تھے۔ کہیں کسی صورت اور کسی حالت میں بھی وہ ان باتوں میں کبھی کچھ پن کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ ہم اسے ناممکن کہہ دیں یا دیوہار اور اصلیت کے وردھ مانیں، پر باپو کا یہی اُٹل دشوار تھا اور دنیا میں یہی اُن کی سب سے بڑی دیشیتنا تھی۔ جس شان اور بہت کے ساتھ اس بات کو انھوں نے اپنے جیون اور اپنی سب یوجناؤں میں عملی جامہ پہنایا اور بنھایا اُس کی مثال دنیا کے بڑے سے بڑے لوگوں کی زندگیوں میں ملنا

کھٹن ہر۔ اس سے بھی بڑھ کر ۲۰ سال تک ہم کروڑ لوگوں کی نگار
 اگوائی کرتے ہوئے ہمالیہ کی طرح انوکھے اصول پر خود اٹل روپ
 سے جے رہنا اور اپنے سارے دیش کو اور سنسار کو صاف
 شبدوں میں اسی پر جے رہنے کے لئے کہتے اور بڑھاوا دیتے رہنا
 اتنا اس کی ایک ایسی نئی گھٹنا ہر جس نے ساری دنیا کے ماتھے
 کو اٹھاہ پریم اور آدر کے ساتھ اُن کے سامنے جھکا دیا۔ مانا کہ
 عملی روپ میں اُن کے دیش نے یا سنسار نے اس اپنے سدھا
 کو نہیں اپنایا، پر اس میں بھی شک نہیں کہ یہ سدھانت اٹل اور
 امر ہیں اور باپو میں جو کچھ اتم بل تھا وہ اسی سدھانت کو
 اپنی جیون کا مول آدھار بنالینے کی وجہ سے تھا۔ جہاں تک
 اُن کے ہاڑ مانس کا سمبندھ ہر اُن میں کوئی انوکھا پن نہیں
 تھا۔ اُن کے جیون میں اگر کوئی انوکھا پن تھا تو یہی تھا کہ وہ
 ان سدھانتوں پر اٹل روپ سے جے رہتے تھے، اور پھوٹا بڑا
 کوئی کام اُن کے خلاف نہ کرتے تھے۔ اسلئے ان کے سدھانتوں کی
 قدر نہ کرنا اور اُن کے ہاڑ مانس کو پوجنا ایسا ہی ہے جیسا ایشور کو
 پھوڑ کر مٹی کو پوجنا۔

باپو کے سامنے سوراج کا جو روپ تھا اور جو جگہ سقیہ اور اہنسا کے
 اصولوں کو انسانی زندگی میں وہ دینا چاہتے تھے، وہ دنیا کی آجکل کی
 ہوا کے بالکل خلاف تھی۔ ہم ادھر کہہ چکے ہیں کہ باپو ایک بڑے انقلاب
 کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔ سو آٹھ کھولتے ہی انھوں نے دکھا کہ
 دنیا کے اتنا اس میں پہلی بار ایک ایسی نئی سمجھتا نے یورپ کے دیشوں میں
 جنم لیکر ساری دنیا پر قابو پا لیا تھا جو اپنے آدرشوں، اصولوں

اور یوجناؤں میں پُرانی ایشیائی سہیتاؤں سے بالکل الٹی تھی۔ پُرانی سہیتاؤں میں دھرم اور انسانیت کے آدرشوں کو سامنے رکھ کر چلتی تھیں اور نیکی، برائی، دوسروں کا بھلا، تیاگ، سیوا، سچائی، ایمانداری اور اہمنا جیسے اصولوں کو انسانی زندگی کے سب سے انمول رتن مانتی تھیں۔ ان سہیتاؤں کا ایک ہی کلش یا مقصد رہتا تھا اور وہ یہ کہ جس طرح بھی ہو سکے انسانی زندگی میں ان اچھائیوں کو بڑھایا اور عملی روپ دیا جادے! سماج سدھار اور سماج کی رچنا کا سارا کام اُنھوں نے اپنے ریشیوں، نبیوں، نبیوں، دیویوں، اللہ والوں اور ایشور بھگتوں کے ہاتھوں میں سونپ رکھا تھا۔ ایسے لوگوں کی ہی وہ سنتھائیں ہوتی تھیں اور انھیں کے وہ ادارے ہوتے تھے جو انسانی سماج کو دھرم اور نیکی کے ٹھیک راستے پر رکھنے کا کام کرتے تھے۔ راج کالج کو اور راج کالج میں گئے ہوئے لوگوں کو وہ ایک طرح سے دیسا ہی سمجھتے تھے۔ جیسا تھائی چار، پتھیار، بانسے، واسے یا اسی طرح کے پیشوں کے لوگوں کو۔ اسی لئے دھرم کی باتوں میں یا سماج رچنا یا سماج سدھار کے کاموں میں راجا کو یا راج کالج والوں کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ ان کا کام کھول دیش کی رکشا کرنا اور سماج کی جو بن پڑے سیوا کرنا ہی تھا۔

پچھلی سہیتا

پچھلی سہیتا اپنے یہاں کے دھرم مذہبوں سے گھور عید کر کے اور اُن کو مٹا کر اپنے منہاسن پر بیٹھی تھی۔ اس سہیتا میں

راج کالج ہی سب سے بڑی چیز تھی۔ اس لئے پچھلی سبھیتا میں دھرم کے اُن چار چیزوں یعنی دان، گیان، دیا اور تپ کو، جن پر پُرانی سبھیتاؤں نے اپنی ساری عمارت کھڑی کی تھی، کاٹ کر پھینک دیا اور اُنکی جگہ چار ایسی چیزوں کو دی جنہیں پُرانی سبھیتا نے کیوں راج کالج تک ہی رہنے دیا تھا، یعنی سام، دام، دند اور بھید۔ پُرانی سبھیتاؤں نے ان چاروں کو راج کالج میں بھی آدھے من سے ہی پہننے کی اجازت دی تھی۔ یہ چاروں اصول ستیہ اور اہنسا سے ٹھیک اُلٹے تھے اسلئے دھرم کے میدان میں راج کالج نیچا سمجھا جاتا تھا۔

پچھلی سبھیتا نے انسانی سماج کے اس پرانے طریقے کو اُلٹ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے سماج کی کایا پلٹ گئی۔ سماجی زندگی کے ہر پہلو میں گراوٹ، بے چینی، ایک دوسرے سے ڈاہ، دشمنی اور طرح طرح کے ستیاناشی اُلٹ پھیر ہونے لگے۔ بچھم کے بے دین سائنس دانوں نے پر کرتی یعنی قدرت کی نئے سرے سے چھان بین کی اور انسانی زندگی کو ستھہ کر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ قدرت کا سب سے اُل قانون یہی ہر کہ جس میں طاقت یا پُرشارتھ ہر دہی زندہ رہ سکتا ہر۔ اسی اصول کو ”سرداول آف دی فیشٹ“ کہتے ہیں۔ پُرانی سبھیتا میں دھرم، سدا چار، ستیہ، اہنسا، دسروں کا بھلا کرنا، سیوا، پریم، شریا، پچھما، دھیرج جیسی چیزوں کو ہی سچے پُرشارتھ کی بنیاد سمجھتی تھیں۔ بچھم نے اس کے خلاف باہوبل، بے دردی، خود غرضی، آبا دھاپی اور ایک دوسرے سے ڈاہ کو انسانی سو بھاد کے بنیادی اصول مان کر انہیں پر سارے سماج کو مستام کرنا چاہا۔

نیتہ یہ ہوا کہ جس کی لالچی اس کی بھینس کا اصول، جسے جنگل کا قانون کہتے ہیں، سمجھیں انسانوں کی زندگی کا اصول بن گیا۔

پچھلی سمجھیتا کا یہ سادہ نسخہ اور یہ دیوار انسانیت سے گرا ہوا اور انسانی سماج کو مٹا دینے والا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کچھم کے نئے دانشوروں اور فلسفیوں نے ”وسودھیو کٹھ کم“ کی جگہ ایک اور نیا اصول گڑھ ڈالا۔ اس کا نام رکھا ”دی گریٹسٹ گڈ آف دی گریٹسٹ نمبر“ (یعنی زیادہ سے زیادہ آدمیوں کا زیادہ سے زیادہ بھلا) اس نئے اصول نے انسانی سماج کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور سب کے بھلے کی جگہ قوموں، ملکوں، فرقوں، سمپردایوں، جاتیوں، پارٹیوں اور اپنے اپنے بکلوں کی بھلائی پر زور دینے جانے کی بنیاد ڈالی۔ سوائتھ اور خود غرضی ایک قدرتی اور جائز چیز سمجھی جانے لگی۔ اس طرح پچھلی راج نیتی نے دنیا میں اس طرح کی سیکڑوں الگ الگ نسکیتوں کا ایک سلسلہ جاری کر دیا جو ایک دوسرے کو کاٹنے اور ساری دنیا کو وناش اور بربادی کی طرف لے جانے لگیں۔ پُرانی سمجھیتا نے اپنی سمجھ میں اس طرح کی طاقتوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔ اب اس مردے میں ایکبارگی پھر سے جان پڑ گئی۔ پُرانی سمجھیتا اپنے کو بے بس سمجھنے لگی۔ یہ نئی شیطانی بیماری ہماری کی طرح ساری دنیا میں پھیلنے لگی۔ پچھلی سمجھیتا کے روپ میں اس نے ساری دنیا پر سکہ جما لیا۔ یہ ہماری امریکہ، آسٹریلیا، افریقہ، جس دیش میں بھی پہنچی وہاں کے پُرانے رہنے

دالوں کی سنلوں کی سنلیں اس نے مٹا ڈالیں۔ جو تھوڑے سے اُدھر سے
 بچ گئے اُنھیں ڈیونڈ منگریشنر کے بچے کچھے عجائب گھری نوٹے بنا
 دیا۔ کروڑوں انسان اپنے گھروں اور اپنے دییش میں امن سے رہتے
 ہوئے بھی ناپید کر دے گئے۔ کچھ کی بابت جو زیادہ سخت جان ثابت
 ہوئے جیسے افریقہ کے کافرا یہ شکایت کی گئی کہ وہ "ابھی تک مٹنے
 سے انکار کر رہے ہیں" انہی سمیتا کے بڑے بڑے دوتاؤں اور جان
 کاروں نے انکے مٹنے جانے کا کارن یہ بتلایا کہ "اُن میں سمیتا کی
 "کمزور برداشت کرنے کی تسکونی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ اسلئے اُنھیں کوئی
 مٹنے سے بچا نہیں سکتا تھا۔"

اس نئی شیطانی سمیتانے تجارت کو چوں کا سب سے بڑا کش
 بتایا۔ پُرانی سمیتاؤں نے تجارت کو تیسرے درجے پر رکھا تھا۔ پہلے
 برہمن دوسرے راجا اور تیسرے دییش۔ اس اُسٹے پن کا نتیجہ
 یہ ہوا کہ راجا سے لے کر دربان تک اور جنتا کا ہر آدمی
 بیوپاری بن گیا۔ گاؤں کے لوگ سمٹ سمٹ کر شروں میں
 ۶۰ فی صدی اور ۸۰ فی صدی تک آ پے۔ گاؤں کی ساری زندگی
 مٹیا میٹ ہو گئی۔ بڑے بڑے ڈراؤنے کارخانوں اور کوئلہ کھانے
 اور دھواں اگلنے والی چیمینوں سے جنم لیا۔ مشین راج کی
 بنیادیں گھری اور مضبوط پڑ گئیں۔ ان بڑے بڑے کارخانوں
 کی پیداوار کو کھپانے کے لئے نئے نئے بازاروں اور سنٹرلوں
 کی ضرورت ہوئی۔ دُنیا بھر کے بازاروں پر قبضہ جمانے
 کے لئے بندو قوں، توپوں، گولوں، زہریلی گیسوں اور ایٹم بموں
 کی ضرورت پڑی۔ بڑی بڑی جنگی سینائیں بنیں جنگی مہمیں

بچھی سامراج سٹا ہی نے دنیا بھر پر اپنا قبضہ
جما لیا۔

اس بڑھتے ہوئے ہو پار، بڑھتی ہوئی تجارت اور پھیلتے
ہوئے سامراج کو بنائے رکھنے کے لئے بھلائی برائی کے بھی نئے
نیم گڑھے بنے۔ بچھم کے پنڈتوں نے اس کے لئے ایک اور نیا
اصول، ایک نیا ایٹم بم تیار کیا۔ یہ نیا ایٹم بم یہ ہے — *All is Fair in Love And War*
دونوں میں جو کچھ بھی کر لیا جائے، جائز ہے۔ اس نئے دیوتا
کی پوجا کے لئے نئے مندروں کی ضرورت پڑی۔ بچھی سمجھتا ہے
ان پنڈتوں نے دیوتا (ریکٹا) پر کینیکل ازم) اور راست دیکھا
(ریل ازم) کے بڑے بڑے اور شہرے کے مندر بنانا اور ان
مندروں کی بے کمر مال دیدی پر دھرم کے چاروں چرنوں دان،
گیان، دیا اور تپ کی قربانی دینا شروع کر دیا۔ اس طرح پُرانی سمجھتا
کے اونچے سے اونچے سدھانتوں کو تھوختے پر تیج کہہ کر انھیں مٹا دیا
اور اپنے شیطانی نالج کے لئے دنیا کا میدان صاف کر لیا۔

اس نئی سمجھتا نے اپنے سے باہر کے سب دیشوں کو دو حصوں
میں بانٹا۔ ایک اسمبھیہ اور دوسرے اردھ اسمبھیہ یعنی ایک جنگلی
اور دوسرے نیم جنگلی۔ نیم جنگلی دیشوں میں انھوں نے چین اور
ہندستان کو شامل کیا۔ جنگلی دیشوں کے لوگوں کو مساکر اُن
کی زمینوں، کھانوں اور جنگلوں پر انھوں نے قبضہ کیا اور
نیم جنگلی قوموں کو ہدی طرح اسمبھیہ بنانے کے لئے اُن کو اپنے
ادھین کیا۔

ہندستانی سبھیتا اتمامی کے شروع سے فکر ہمیشہ باہر کے لوگوں، راجاؤں، قوموں، مذہبوں اور سبھیتاؤں کا دل سے ہوا کرتی رہتی تھی۔ ہر پرہیسی ہمارے یہاں دیا اور پنیم کا مستعار سمجھا جاتا تھا۔ یہ دانش دنیا بھر کے دکھیوں کا، چاہے وہ کسی دیش، دھرم یا سمپر داسے کے ہوں، ہمسایان گھر سا ہوا تھا۔ اندر یا باہر کسی کو دکھ پہچانا یہ اپنے دھرم کے ثروت سمجھا تھا۔ اس دیش نے سداس کے ساتھ ان کا سا پنیم رکھا۔ اسی پنیم کے بل پر اُس نے کروڑوں کو اپنی سبھیتا کے گھر سے رنگ میں رنگ کر حیوانوں کو انسان، غلاموں کو سواران اور اردھکیوں کو سبھیہ بنا دیا۔ پر پنیم کے جھانڈ پر اپنا سب کچھ بیڑ بھاؤ کر کے بھی ہمارا دیش انھیں اپنا نہ بنا سکا۔ انھانکے ریل اور جوتیوں کا مارو پ آخر تک جیسے کا جیسا بنا رہا۔

اس دیش کے راجاؤں نے اپنے باپوں سے پنیم کے حلے کا مقابلہ کیا۔ باپوں ہندستانی سبھیتا نہیں تھی، مانتا پڑھنے کے بعد ہماری سبھیتا نے باپوں کو راجہ کانت سے بھی باہر نکال دینے کی کوشش کی تھی۔ ہماری سبھیتا اپنی انوکھی دھرمی اور روحانی باتوں سے سدا سارے سفار کر سیتھی اور املاتی رہتی تھی۔ اگر اس دیش کی سبھیتا پنیم سے بھی بڑھنے کر ڈراؤنی زہریلی گلیوں اور ایٹم بم بنا کر اُن کے ورے پنیم کو جیت لیتی تو اس سے یورپ کا ناش تو ہوتا یا نہوتا اتنا ضرور ہوتا کہ ہماری سبھیتا دنیا کے لئے یورپ کی سبھیتا سے بھی زیادہ خطرناک بن جاتی۔ اس کا دوسرا کوئی

نتیجہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہمارا دیش اس راستے پر پڑ جاتا تو ہماری سبھیتا کا پاک مشن، اُس کا انوکھا اور اونچا آدرش سدا کے لئے ختم ہو جاتا۔ پچھم کی غلامی سے آزاد ہونے کی جگہ وہ انت سے کے لئے اُس کی غلام اور باندی بن جاتی۔ ہماری سبھیتا کی آتما اسے نہیں سہہ سکتی تھی۔ اس لئے اسے پچھم کے مایاوی جمال، ولوں کی مادہ پرستی کو چھوڑ کر، فوجوں، توپوں، گیسوں اور بموں کی مدد نہ لے کر، اپنی آدھیاत्मک اور نیتک یعنی روحانی اور اخلاقی گہرائیوں میں غوطہ لگانا پڑا۔ ہماری سبھیتا نے دو سو برس تک ان گہرائیوں کا مستحق کیا۔ اُس نے اپنی آن پڑائی شکیتوں کو جگایا جن کا رام چندر جی نے دی بھیش کو بہورا دیا تھا۔ ان شکیتوں کو وہ رُوپ دے کر جس سے وہ ساری دنیا کو ان نئی آفتوں سے بچا سکیں، ہماری سبھیتا نے اور ہمارے دیش نے ہاتھ گا ندھی کو جمع دیا اور انھیں ان شکیتوں کے تجربے کرنا سکھلایا۔ باپو ہندوستانی سبھیتا کے دھرم پریم اور اُس کی روحانیت کے ساکشات اوتار تھے۔ وہ اُن کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ سنار کی سیوا کرنا اس دیش کا سدا سے پاک مشن رہا۔ اس مشن کو پورا کرنا ہی ہمارا گا ندھی کا کام تھا۔

پچھی سبھیتا اور باپو

باپو کو پچھی سبھیتا کے اس بیدنی پن اور اُسکی حیوانیت سے

بڑی نفرت تھی۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر انگریزی راج چلا گیا اور پچھلی
 سمجھتا اس دیش میں رہ گئی تو انت کال کے لئے دیش کو اس
 سمجھتا کی غلامی میں رہنا پڑے گا۔ کیونکہ پچھلی سمجھتا کے رنگ میں رنگ
 ہوا دیشی راج اگر ایک بار دیش میں جم گیا تو اُسکی جڑیں بدیشی
 راج کی جڑوں سے کہیں زیادہ گہری پڑ جائیں گی۔ اس لئے گاندھی
 جی کو حاکموں کے کانے یا گورے ہونے کی اتنی چنتا نہیں تھی جتنی
 اس بات کی کہ جو راج بھی ہو وہ دیش کے پڑانے سے دھڑی پن
 اور نیکی کی بنیادوں پر قائم ہو۔

پچھلی سمجھتا کے اس اصول کو کہ "پہلے اپنی اچھاؤں اور
 ضرورتوں کو بڑھاؤ اور پھر اُنھیں پورا کرنے میں اپنی ساری تنگی
 لگا دو" باپ سہ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ یہ دیکھتے تھے کہ اسی تعلیم سے
 بچم میں بھوک و لاس اور عیش پرستی کا وہ طوفان کھڑا کر دیا ہے جس
 کے رہتے آدمی اپنا اصلی بھلا بُرا سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جب تک یہ غلام
 شانت نہ ہو دنیا کی مصیبتیں دور نہیں ہو سکتیں اور نہ دنیا کو سماؤ
 شانتی مل سکتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دل داغ اور آچار و چار کی غلامی
 تن کی اور جہن کی غلامی سے کہیں زیادہ بُری اور خطرناک ہے۔ سچ یہ
 ہے کہ من کی غلامی میں ہی تن کی غلامی کی جڑیں گہری جاتی ہیں اور
 ادھک پکڑی ہو جاتی ہیں۔ کسی نے ایک بار باپ سے پوچھا کہ آپ کے اور
 پنڈت مندرو کے راج کا جی چاروں میں کیا فرق ہے؟ انھوں نے جواب دیا
 کہ "بہت فرق ہے! پنڈت جہاں ال جی چاہتے ہیں کہ انگریز
 دیش سے چلے جائیں اور انگریز رہ جائے میں جہاں کہ انگریز چلے
 جائے انگریز رہ جائیں" اس سے باپ نے ٹھیک ٹھیک دیکھو اور ان کا پتہ چلتا ہے

اپنے ”ہند سوراج“ میں انھوں نے پچھلی سبھیتا کے بارے میں اپنے
دچار صاف صاف دئے ہیں۔ ہم انھیں کے شبدوں میں نیچے دیتے
ہیں وہ لکھتے ہیں —

”آج کل کی سبھیتا کے موہ جال میں پھنسنے ہوئے لوگ بھلا
اُس کے خلاف کیوں لکھیں گے؟ وہ تو اُسے ایسی باتیں اور دلیلیں
کھوجنے کی کوشش کریں گے جن سے اُن کی باتوں کا سمرقن ہو۔
پہلے تو ہمیں اس پر دچار کرنا چاہئے کہ اس سبھیتا کی حفاص
پہچانیں کیا ہیں۔

”ایک سچی پہچان تو اس کی یہ ہو کہ آج کل سبھیہ کھلانے
والے لوگ تن کے سکھ کو ہی اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد
مانتے ہیں۔

”کسی دیش کے لوگ اگر پہلے بہت کپڑے اور کوٹ بوٹ پہننے
کے عادی نہیں تھے اور پھر انگریزی کپڑے پہننے لگے تو سمجھا جاتا ہے کہ
یہ جنگلی پن سے نکل کر اب سبھیہ ہونے لگے۔

”یورپ کے لوگ پہلے ہاتھ سے کام کرتے تھے اور معمولی ہل
سے اپنے کام کے لائق کھیت جوت لیتے تھے۔ اب بھاپ کی مشینوں
کے سمارے ہل چلا کر ایک ہی آدمی سیکڑوں بیگھے زمین جوت ڈالتا
ہو اور بہت سا اُن پیدا کر سکتا ہے۔ یہ بڑھی ہوئی سبھیتا کی
پہچان سمجھی جاتی ہے۔

”پہلے بیل گاڑیوں پر دن بھر میں ۱۲ کوس کی منزل طے
ہوتی تھی اب ریل گاڑیوں میں دن بھر میں لوگ ۴۰۰ کوس کی اڑان
مارتے ہیں۔ یہ سبھیتا کا بڑا اونچا درجہ مانا جاتا ہے۔

”کہتے ہیں کہ بڑھتے بڑھتے جلدی ہی وہ دن آدے گا، جب لوگ ہوائی جہازوں پر سوار ہو کر دو چار گھنٹے میں ہی جس دیش میں چاہے پہنچ جاویں گے۔“

”بٹن دباتے ہی پہننے کے کپڑے سامنے آ جائیں گے، دوسرا بٹن دباتے ہی تازہ اخبار سامنے آ جائے گا، سیسر بٹن دباتے ہی ہوا کھانے کے لئے سوڑا کھڑا ہوگی، اشارہ کرتے ہی طرح طرح کے کھانے پر دسے ہوئے سامنے آ جائیں گے۔ مطلب یہ کہ مشین کے بل پر چھوٹے بڑے سارے کام سمج ہی میں اپنے آپ بھرنے لگیں گے۔“

”پہلے لوگ جانوروں کی کھال پہنتے تھے اور بھالے برچھی سے بڑھتے تھے، آج لوگ بھالے برچھی کی جگہ ایک پر ایک چھ گویاں چلانے والے پستول رکھتے ہیں۔“

”پہلے لوگ جب لڑتے تھے تو گتھم گتھا ہو جاتے تھے۔ اب پھاڑکی آڑ میں مشین گن کے پیچھے کھڑا ہوا ایک آدمی ہلکے مارے مارے ہزاروں کی جان لے سکتا ہے۔ یہاں سمجھتا ہے۔“

”پہلے لوگ آزادی کیساتھ جب جی چاہا کھلی جگہوں میں کام دھندے کرتے تھے۔ اب ہزاروں آدمی جمع ہو کر اپنا پیٹ پالنے کیلئے بڑے بڑے کارخانوں اور کھانوں میں کام کرتے ہیں۔ انکی حالت جانوروں سے بھی گئی بیٹی ہے۔ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بڑے بڑے موکم کے کاموں میں انھیں پلٹا پڑتا ہے اور وہ بھی کروڑ پتی سا ہو کاروں کی جیبیں ابھرنے کے لئے۔“

”پہلے لوگوں کو مار مار کر زبردستی غلام بنایا جاتا تھا آج انھیں دھن اور دھن سے لئے والے ~~کام~~ آرام کا، لاپنج

دیسے کہ فلام بنایا جاتا..... ہر ادھک کیا کہوں..... یہی
سبھیتا کی پہچانیں ہیں اور اگر کوئی ان باتوں کو سبھیتا کی پہچان نہ مانے
تو اُسے نرا اناڑی مانا جاتا ہے۔

”یہ سبھیتا نہ تو دین دھرم کا دھار کرتی ہیں اور نہ نیکی بری پر دھیان
دی ہے۔ اس سبھیتا کے حمایتی بڑی گمبھیرتا کے ساتھ کہہ ڈالتے ہیں کہ دین
دھرم رکھنا ہمارا کام نہیں ہے!“

”ہندستان میں جہاں یہ پاگل سبھیتا نہیں پہنچی ہو وہاں
اپنی ویسی ہی حالت ہے جیسی کبھی پہلے تھی۔ جن لوگوں کو دیش
کی لگن ہو انہیں میں یہ صلاح دوں گا کہ آپ پہلے اپنے دیش کے
اُس حصے میں جائے جہاں ابھی تک ریل کی پہنچ نہیں ہوئی ہے اور
چھ مہینے تک وہیں گھوم بھر کر سچی دیش بھگتی اپنے اندر پیدا کر لے۔
اس کے بعد سوراخ کی باتیں کرے گا۔“

”یہ سبھیتا ایسی ہے کہ اگر ہم دھیرج رکھیں تو انت میں اس سبھیتا
کی آگ سلگانے والے خود ہی اس میں جل مر جائیں گے۔“

”اسلام کی نگاہ سے اس سبھیتا کو شیطانی سبھیتا کہنا ہوگا، اور ہندو

دھرم نے اسے گھور کلجگ کہہ کر بیان کیا ہے۔“

پچھیں سبھیتا کا اتنا سندر چتر باپو کے لیکھوں میں ہم نے اور
کہیں نہیں دیکھا۔ جو پیشین گوئی باپو نے اس میں کی ہے کہ اس
سبھیتا کی آگ سلگانے والے آپ ہی اس میں جل مر جائیں گے، اسے
ابھی ۴۰ برس ہی ہوئے ہیں۔ پر اتنے نفوڑے سے میں انھوں نے
ادھم نے اس اتنی بڑی سبھیتا کو خود اپنی آگ میں جلتے ہوئے
اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ باپو کوئی جوتشی نہیں تھے۔ انھوں نے

یہ بھوشپہ بانی نیکی اور بری کے بڑھنے گھٹنے اور ایکس دوسرے پر ان کے اثر کو دیکھ کر اور ان کے نتیجوں کو سامنے نہ کھنکھ کر بائبل ایک دگپانی کی طرح حساب لگا کر کی تھی۔ ہمیں مادی سائنس میں یعنی اوپر کے جز جگت اور اُس کی کھوج کرنے والے لوگوں کے بتائے ہوئے نیوں اور قانونوں میں شردھا ہو، اس لئے کہ ان نیوں کے نتیجے صاف اور اُسی سے دکھائی دے جاتے ہیں۔ پر ادھیاتم یعنی روحانی ددیا کے جاننے والوں نے نیکی بری کی طاقتوں کے تجربے کے اور انکے اثر اور نتیجوں کو دنیا میں دیکھ کر جو نیم اور قانون بنائے ہیں اُن پر ہمیں اتنا بھروسہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کے نتیجے ذرا دیر میں نکلتے ہیں اور ان کا سمبندھ باہر کی چیزوں سے کم اور ہمارے اندر کے بیوں سے ادھک ہو۔ دگیان یا سائنس کی بنگاہ سے اس سے بڑی بھول ہم نہیں کر سکتے۔ پھر بھی ہمیں اپنے سائنسداں ہونے کا ابھیان ہو! جب تک ہم ان نیوں کی اصلیت کو اور اُن کے اُٹل ہونے کو نہیں مانیں گے اور اپنے سب کاموں، بوپار، دیوہار اور راج کاج کو انھیں نیوں پر اور ان کا دھیان رکھتے ہوئے نہیں ڈھالیں گے تب تک دنیا کی کوئی طاقت ہمیں دکھوں اور بربادی سے نہیں بچا سکتی۔

پار لیمینٹی راج

ہم باپ کے خاص خاص اصولوں کو بیان کر چکے۔ جسے کو ختم کرنے سے پہلے اب ہم پار لیمینٹی راج کے سمبندھ میں باپ کی رائے اور دیدنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ بھی سمیٹنا سے اُسکا گہرا سمبندھ ہو اور گاندھی جی نے اپنے ودھان میں اس

پارلمینٹی راج کا خاص شور سے ذکر کیا ہو۔ بچم کی اس سبھیتا نے ہی آج کل کے پارلمینٹی راج کو جنم دیا ہو۔ اسلئے اس پارلمینٹی راج میں اپنی جنم دینے والی ماں کے سارے عیب کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ یہ پارلمینٹی راج کب سے اور کیسے چلا۔ اس کا جنم انگلستان میں ہوا تھا۔ انگلستان کے راجا نے جنتا پر اپنا ادھیکار جمائے رکھتے اور جنتا سے ادھک سے ادھک ٹیکس وصول کرنے کے لئے اس دیش میں پارلمینٹی راج چلایا تھا۔ دھیرے دھیرے پارلیمنٹ کا بل بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اس نے دیش کے راجا کا گلا کاٹ کر اس کی گدی بے لی۔ انگلستان کی دیکھا دیکھی اس طرح کے الٹ پھیر محفوظ ہے سے سے کے اند لگ بھگ سارے یورپ میں ہونے لگے اور پارلمینٹی راج کا سکہ ساری دنیا پر جم گیا اور آج بھی جما ہوا ہو۔

دنیا کے عام لوگوں میں پارلمینٹی راج کی اتنی چاہ کیوں ہو اس کا کارن یہ ہو کہ یہ راج عام جنتا کا راج سمجھا جاتا ہو۔ اسی لئے ہر دیش کی جنتا پاگوں کی طرح اس کے پیچھے دوڑتی ہو اور خوشی خوشی اسے اپنے راجا کی جگہ دے دیتی ہو۔ اس میں جنتا اس طرح راجا بنائی جاتی ہو کہ لاکھوں آدمی اپنا ایک پرئی ندھی یا نمائندہ یا ادویا چلتے ہیں اس لئے کہ وہ ان کی اور سے راج کرے۔ ان لاکھوں آدمیوں میں سے ۱۰۰ پیچھے ۹۵ نہ اُسے جانتے ہیں نہ پہچانتے ہیں۔ پھر بھی وہ اُن کا نمائندہ مانا جاتا ہو۔ چنے جانے کے بعد یہ نمائندہ

انکی بات بھی نہیں پوچھتا، رُٹا نہیں کوئی اصلی فائدہ پہنچا سکتا ہو۔ کیوں کہ وہ تو اسی طرح کے تین چار سو نائیدوں میں سے ایک ہوتا ہو۔ اس طرح ایک راجہ کی جگہ تین چار سو راجہ اور منتریوں یا دزیوں کی شکل میں دس ہیں ہمارا راجہ یا سمراٹ بن جاتے ہیں۔ اور جتنا بیجا پی دسی کی دسی ”چیری“ ہی رہ جاتی ہو، راج کالج چلانے کا خرچ پہلے سے سیکڑوں کا بڑھ جاتا ہو۔ سرکاری نوکروں کی گنتی، تنخواہیں اور بھتے الگ بڑھ جاتے ہیں۔ ان نوکروں اور افسروں کی تانا شاہی میں فرق نہیں آتا، شان شوکت کے آڈمبر چرانے سمراٹوں کو بھی شرماتے ہیں اور یہ کہلاتا ہو جنتا کا راج !

پارلیمنٹری راج اور باپو

باپو اس سارے مایادی پر قح کو جو بھوں جنتا کو راجا بننے کا وجہ دے دیکر اُس کے بے حساب چھ سے جاننے کا راستہ کھول دیتا ہو، جڑ سے بدل دینا چاہتے تھے۔ باپو اپنے کو سچا ڈیموکریٹ سمجھتے تھے۔ سچا لوک منتری کہتے تھے۔ ڈیموکریسی یعنی لوک، راج کا ان کے سامنے ایک ہی ڈوب تھا اور وہ یہ تھا کہ جتنا نام کے لئے نہیں بلکہ سچ سچ آپ اپنی راجا ہو اور اپنا سارا کام بار خود کرے۔ باپو کے سامنے اس کا ایک ہی طریقہ تھا، وہ تھا دی سینٹرلائزیشن یعنی دیکیندری کرن یا غیر مرکزیت، جسکا مطلب یہ ہو کہ حکومت کی ساری طاقت کو ایک جگہ جمع نہ کر کے چاروں طرف، وہ لوگ بانٹ دیا جاوے، دیش کو امنے چھوٹے چھوٹے حلقوں میں بانٹ دیا جائے کہ ہر جگہ ہر

بوسے لوگوں کو اپنا اوریا یا راجا بنا سکے ، وہ اوریا یا پنج اپنے حلقے کی سبھی راج کا جی اور دوسری ضرورتوں کو جنتا کی مدد سے پورا کر سکے اور جیگاڑا ضاد کرنے والوں سے اپنے حلقے کی رکشا کر سکے۔

پارلیمنٹری راج میں نا اہلیگی کا ڈھونگ تو ہے ہی ، اس ڈھونگ سے بڑھ کر چناؤ کا ڈھنگ ہے۔ یہ چناؤ کا ڈھنگ جنتا کو چاروں طرف سے مٹانے اور برباد کرنے والا ہے۔ اس میں ہر طرح کی بے ایمانی ، دھوکا ، فریب ، جرم ، زیادتی آئیے ، فضول خرچی اور دشمنی کا ایک سوتا کھل جاتا ہے۔ اس چناؤ نے دیش کے دیش برباد کر دیے۔ اس کی برائیاں دنوں دن بڑھتی جا رہی ہیں ، پر اس کے سدھار کی کوئی صورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔ باپو اسکے سدھار کا ایک ہی ڈھنگ بتاتے تھے۔ یہ کہ ددڑوں کی جانکاری کو اور اُن کے چلن کو ، اُن میں نیکی اور ہدی ، بھلے اور بُرے کے بچار کو اتنا اونچا کر دیا جاوے اور ان گنوں کو اپنے اندر بنائے رکھنے کی جنتا میں اتنی شگفتی آ جاوے کہ وہ ہمیشہ ایسے لوگوں کو ہی دوٹ دے جو نیک ہوں۔ تیاگی ہوں ، دوسروں کی سیوا اور اُن کا بھلا کرنے والے ہوں اور جن میں ، ایمانداری ، سادگی اور نترتا ہو۔ جب تک جنتا میں یہ شگفتی پیدا نہیں ہوتی ، تب تک پارلیمنٹری راج جنتا کے لئے راجاؤں کے راج سے زیادہ بُرا ثابت ہوگا !

جاں تک دیش کے مرکزی راج کو مضبوط رکھنے کا سوال ہے وہاں تک گاندھی جی تین باتیں چاہتے تھے۔ ایک یہ کہ جنتا کے

نمائندے سدا چاری اور تیاگی ہوں۔ دوسرے یہ کہ ان نمائندوں سے
 بھی سیوا لے سکنے کی جنتا میں شکنتی ہو۔ تیسری یہ کہ انھیں جب چاہے
 بدل سکنے کا بھی جنتا کو ادھیکار ہو۔ پر آج کل کی حالت میں ان
 تینوں باتوں کا ہو سکنا نامکن ہے اس لئے بالو راج کے اوپری روپ کو
 اتنی بڑی چیز نہیں مانتے تھے۔ وہ کسی بھی راج کے اچھے بڑے ہونے کی
 سب سے بڑی کسوٹی یہ مانتے تھے کہ وہ راج دھرم اور نیکی کے راستے
 پر چلتا ہے یا نہیں، جنتا کا سپا سیک ہے یا نہیں، بیج تیج اس میں
 جنتا ہی راجہ ہے یا نہیں۔

پارمینٹی راج میں چٹاؤ سے بھی بڑی چیز اس کی وہ دل بندی
 ہے، جسے پارٹی سسٹم کہا جاتا ہے۔ اس راج میں دو پارٹیوں کا
 ہونا دیش کے فائدے کے لئے ضروری مانا جاتا ہے۔ اس کے بنا
 پارمینٹی راج چل ہی نہیں سکتا۔ کم سے کم دو پارٹیاں تو ہونی ہی چاہئیں
 جن کا یہ جہم سدھ اور قدرتی حق ہو کہ وہ ایک دوسرے کو گرانے اور
 مٹانے کی کوشش کرتی رہیں۔ اس طریقے نے مارکاٹ اور غونی انقلابوں
 کو ضروری بنا دیا ہے۔ اس پارٹی بازی نے سارے دیش کے سدا چار کو
 اور دیش کے اصلی فائدے کو جو دھکا پہنچا ہے اس کا کوئی اندازہ نہیں
 کیا جا سکتا۔ پارٹی بازی دیش بھر میں امر ہو کر گاؤں گاؤں اور کوٹے
 کوٹے میں پھیل جاتی ہے۔ ہر آدمی کا یہ قانونی فرض اور دھرم ہو
 جاتا ہے کہ وہ نیائے آئیائے، بیج پھوٹ یا خود اپنے ایمان تک کا
 خیال نہ کرتے ہوئے اپنی پارٹی والے کو ہی ووٹ دے۔
 ان برائیوں کے علاوہ پارمینٹی راج میں کبھی سمجھتا کی طرح
 بناوٹ، بھوٹ اور فریب بھرا ہوا ہے۔ اس طرح کا راج سرے

باپوں تک بُرائی اور حیوانیت میں ڈوبا رہتا ہے۔ اسی لئے باپو کو جتنی نفرت کبھی سمجھتا ہے تھی اتنی ہی پارلیمنٹی راج سے تھی۔ اُنھوں نے اس کے سمندر میں بھی اپنی کتاب ”ہند سراجیہ“ میں نیچے لکھے شبدوں میں اپنے دِچار ظاہر کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

”انگلینڈ کی اس سب سے جو حالت ہے اُسے دیکھ کر تو سچ سچ دُعا آتی ہے، اور میں تو ایشور سے مناتا ہوں کہ ویسی حالت بھارت کی کبھی نہ ہو۔ جسے آپ پارلیمنٹوں کی ماں کہتے ہیں وہ انگلینڈ کی پارلیمنٹ تو بانجھ اور دیشیا ہے۔ یہ دونوں شبد کڑے ہیں پر اس پر پوری طرح لاگو ہوتے ہیں۔“ (۲۳، ۲۱)

”..... پر آج اتنا تو سبھی سوچا کرتے ہیں کہ پارلیمنٹ کے ممبر ڈھونگی اور سوار تھی، ہوتے ہیں..... جس دَل کا جو ممبر ہوتا ہے، وہ اُسی دَل کو آنکھ بند کر کے اپنا دوٹ دیتا ہے، کیونکہ ”ڈسپلن“ یعنی قاعدے داری کے خیال سے وہ ایسا کرنے کیلئے مجبور ہے۔ کوئی اس سے اپو اور دپ نکل جاوے تو اسے باغی اور اسکے کام کو بغاوت سمجھا جاتا ہے۔..... (پنا ۲۶)

پارلیمنٹی راج کے لئے مرتے دم تک باپو کی یہی رائے رہی اس کے سمندر میں بھی اُنھوں نے جو بھوشیہ بانی کی تھی یعنی یہ کہ اگر پارلیمنٹی راج اس دیش میں قائم ہو گیا، تو اس دیش کا ناش ہو جائیگا، یہ بھوشیہ بانی ان کی کبھی سمجھتا والی بھوشیہ بانی سے بھی زیادہ جلدی پہنچی ثابت ہو رہی ہے۔

باپو پارلیمنٹی حکومت کے خلاف تھے۔ پھر بھی کبھی سمجھتا کی چکا چوندرہ نے اس دیش کے پڑھے لکھے لوگوں کو اس کے لئے

ایسا باؤلا کر دیا تھا کہ باپ اُنہیں اُس کی طرف جانے سے کسی طرح بھی نہ روک سکے، دیش کے نیتاؤں نے اپنی ساری شکتی اس بات پر لگا دی کہ باپ اپنے سوراج کی تحریک "مقصد صاف شبدوں میں پارلیمنٹی راج کو مان لیں۔ ان نیتاؤں کا خیال تھا کہ اگر سوراج کا رُوپ اس طرح صاف کر دیا گیا تو انگریزوں کی طرف سے بھی دیرودھ کم ہو جاوے گا اور دوسرے ایشیوں کو بھی ہندستان کی طرف سے اطمینان ہو جاوے گا۔ شری ہارپو دیسائی نے "ہند سوراج" کے اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ کے ایڈیشن کی پرستاد میں باپ کے نیچے لکھے شبد نقل کئے ہیں:-

"اس کتاب میں آج کل کی سمیٹا کی بڑی نندا کی گئی ہو۔ یہ سنہ ۱۹۰۸ میں لکھی گئی تھی۔ پر آج تو اس بارے میں میرا دشواس اور بھی پکا ہے۔"

"پر میں اپنے پاشک کا اس طرف خاص دھیان دلانا چاہتا ہوں کہ آج میرا بچہ (مقصد) وہ سوراج نہیں ہے جس کا بیان اس پشتک میں ہوا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ہندستان اُس کے لئے پودے طور سے تیار نہیں ہے۔ ایسا کہنا ڈھٹائی تو معلوم ہوگی پر مجھے پکا دشواس ہی ہے کہ میں خود تو اُسی سوراج کے لئے کام کرتا ہوں جس کا چتر اس کتاب میں کھینچا ہے۔ پر ہم سب لوگ مل کر جو کام کر رہے ہیں وہ ہندستان کے لوگوں کی اچھاؤں کے انوسار پارلیمنٹی سوراج پانا ہے۔"

باپ کا یہ بیان اُن کے سو بھاؤ کی ایک خاص بات کو بڑے عجیب ڈھنگ سے درشتاتا ہے۔ یہ بات سے سے پر پرگٹ ہوتی

رہتی تھی۔ اس کے کارن جتنا میں اور کام کرنے والوں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں بھی پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ بات یہ تھی کہ کسی دوسرے کے کام اور طریقے چاہے باپو کے اپنے طریقوں کے کتنے بھی خلاف کیوں نہ ہوں، خود اپنے سدھانتوں کے اندر رہتے ہوئے باپو جہاں تک ہو سکے دوسرے کے کاموں میں صلاح اور مدد دیتے رہتے تھے۔ یہ بات اُن کی اُدارتا، ان کے بڑے دل اور ان کے پریم کی جرم سیما تھی۔ وہ مانتے تھے کہ ہر آدمی یا ہر گروہ کا اصل بھلا اسی میں ہے کہ وہ جس بات کو ٹھیک سمجھتا ہے اسے پورا کرنے کی کوشش کرے۔ وہ جانتے تھے کہ ستیہ کی کلپنائیں انیک ہیں، اور جتنا ان کا ستیہ ان کو پیارا ہے اتنا دوسروں کو بھی اپنا ستیہ پیارا ہے۔ اس مدد دینے میں وہ اتنا ضرور دیکھ لیتے تھے کہ اس میں ان کا کوئی بنیادی اصول تو نہیں ٹوٹتا اور وہ خود اپنے اصول یا اپنے ستیہ سے تو نہیں الگ ہو رہے ہیں۔

باپو نے اپنے اس بیان میں کہا ہے کہ "میں تو اپنے خیال میں اپنے ہی سوراچ کے لئے کام کر رہا ہوں۔" معمولی طرح سے ہمیں ان کے جیون کے اس پہلو کو سمجھ سکتا بہت کٹھن ہے۔ پارلیمنٹی راج قائم کرنے کے لئے جس سے ان کو نفرت تھی اور جسے وہ دلش کو برباد کرنے والا سمجھتے تھے، کھلے طور پر کانگریس کی اگوائی کرنا اور پھر اس دُچار میں ڈوبے رہنا کہ میں اس طرح اپنے ہی ڈھنگ کے سوراچ کے لئے کوشش کر رہا ہوں، باپو جیسا آدمی ہی کر سکتا تھا۔ یہ کام بڑا کٹھن ہے لیکن اگر ہم باپو کی ساری زندگی پر گہری نظر ڈالیں تو ہم پگ پگ پر انھیں اسی راستے پر

چلتا پلتے ہیں۔ دنیا میں اچھائی برائی، نیکی بدی، اس طرح ایک دوسرے میں ملی جلی ہے کہ کوئی کرم یوگی ان میں سے ایک کو دوسرے سے بالکل الگ نہیں کر سکتا۔ اس سے بھی گہری بات یہ ہے کہ برائی کو بھلائی میں بدلنے کے لئے ہمیں بڑے دل، بڑی ادارت، بڑے دھیج بڑی ہمت اور شردھ سے کام لینا پڑتا ہے۔ جب کبھی کوئی باپو کی بات نہ مان کر ان کی مرضی کے خلاف جاتا تھا تو اس کے ساتھ باپو کی ہمدردی اور سیوگ میں کوئی کمی نہ آتی تھی۔ کانگریس نے ان کی ایک بات بھی دل سے نہیں مانی۔ یہاں تک کہ انھیں کانگریس کی ممبری چھوڑنے پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ پھر بھی باپو کانگریس کی برابر سیوا کرتے رہے۔ کرانت کاری دل کے لوگوں کے لئے، کیونٹوں، سوشلسٹوں اور سب کے لئے ان کے دل میں جسگد تھی اور اپنے سدھانتوں کے بھیتر رہتے ہوئے وہ ان میں سے ہر ایک کی صلاح مشورے سے اور جس طرح بھی ہو سکتا تھا برابر مدد کرتے رہتے تھے۔ شری راجاجی، سردار پٹیل، پنڈت جواہر لال نہرو، آخر کے دنوں میں باپو راجندر پرساد تک گاندھی جی کی صلاحیں ماننے سے انکار کرتے رہتے تھے اور جی کھول کر ان صلاحوں سے بے پروا ہی دکھاتے رہتے تھے۔ ہر اپنے ان چلنے سرشتیوں کی طرف باپو کے پریم اور دیدہ ہار میں تل برابر بھی فرق نہیں ہونے پاتا تھا۔ باپو جانتے تھے کہ ان کے اس ڈھنگ سے جنتا میں بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ دن رات اس کی شکایتیں ان کے پاس پہنچتی رہتی تھیں۔ پر وہ کبھی ایک قدم بھی اپنے راستے سے نہیں ہٹے۔ وہ ہٹ سکتے بھی نہیں تھے۔

ستھ اور اہنا کا یہی عجیب راستہ تھا جس پر چلتے رہنا وہ اپنا دھم مانتے تھے۔

اسی طرح پارلیمنٹی راج کے خلاف ہوتے ہوئے بھی انھوں نے کانگریس کو پارلیمنٹی راج حاصل کرنے میں مدد دی۔ وہ کانگریس کے پروگرام میں سے اسپوگ آئڈن کو نکال دینے کے خلاف تھے پھر بھی دیش والوں کی اچھا کے انوسار انھوں نے اسے نکال دیا۔ کونسلوں میں جانے کے وہ دل سے خلاف تھے، پھر بھی انھوں نے کونسلوں میں جانے کا سمجھاؤ خود پیش کیا تھا۔ سوراج پارٹی سے بنیادی فرق ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اس کی مدد کی کہ پنڈت موتی لال نہرو اور شری چترنجن داس پھر سے ان کے بھکت بن گئے۔ باپو کا جیون اس طرح کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔

اب ہم باپو کے ان سب دچاروں کو موٹے طور پر بیان کر چکے جن کو جان لینا ہماری رائے میں باپو کے نئے ودھان کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ ہم ان دچاروں کو مانیں یا نہ مانیں، ہم انھیں نیک سمجھیں یا غلط، ہم انھیں گئے بیتے زمانے کی عزت دنیا کو پیچھے گھسیٹنے کی کوشش کہیں یا نئی دنیا کو لانے کا جن کہیں، ہم انھیں سچے گیان اور بیوہار دونوں کا عطر اور پنجوڑ سمجھیں یا نا سمجھی کی اور ان ہونی باتیں مانیں، ہمیں یہ ماننا ہی پڑے گا کہ باپو کے مرتے دم تک اس سمبندھ میں یہ دچار ہے۔

ہم آگے کے لئے دیش کی تعمیر کے کام میں باپو کے دچاروں اور مرتیوں سے مدد لینا چاہتے ہیں تو ان دچاروں کے شدھ

دوپ کو سمجھ لینا ہمارا فرض ہے ، تاکہ ان سے جو شکنی دیش میں پیدا ہو سکے اُسے ہم اپنے دیش اور اپنے ساج کی تعمیر میں پوری طرح کام میں لاسکیں ۔

راج کالج کی شکستی سے اور دنیا کی دوسری باہری شکستوں سے ٹھیک ٹھیک کام لینے کے لئے آتم بل اور سدا چار کی ضرورت ہوتی ہے ۔ نہیں تو یہ شکستیاں ہمیں اونچا لے جانے کی جگہ گراوٹ کی طرف لے جاتی ہیں ۔ باپو کے طریقوں کو ہم نے شدھ دوپ میں نہیں برتا ۔ پھر بھی ہم نے جس دھبے تک ان پر عمل کیا اس سے بھی دیش میں ایک اونکھی طاقت ، جاگرتی ، نڈرتا اور اتنی بڑی سرکار سے ٹکر لینے اور نقصان سہنے کی شکستی ہم میں پیدا ہوگئی ، ہر سچا سدا چار ، سچا نیاگ اور آتم بل پیدا نہ ہو سکے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی تو مل گئی ، پر اس کی قیمت ہمیں ملک کے بنوارے اور باپو کی جان لے لینے کی صورت میں بھرنی پڑی ۔ اس سے زیادہ بد نصیبی ہمارے لئے اور کیا ہو سکتی تھی ۔ اگر اب بھی ہماری آنکھیں نہ کھلیں تو ہمیں اس سے بھی زیادہ قیمتی ادا کرنی پڑیں گی ۔ ان آفتوں سے بچنے اور سچی اُتنی کے راستے پر پیر جما کر چلنے کا ایک ہی طریقہ ہے ۔ وہ یہ ہے کہ نیکی اور بدی کے اصولوں میں ، نیک کاموں کے نیک نتیجوں اور بُرے کاموں کے بُرے نتیجوں میں ہمیں پکا دشواس ہو ۔ ہم ان اصولوں کو اٹل اصول مانیں ، اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں کے سامنے ، یا یہ سوچ کر کہ ان اصولوں پر عمل کرنا کٹھن ہے ہم کسی بھی سناری یا راج کا مئی مطلب کو پورا کرنے کے لئے نیکی بدی کے اونچے اظہوں کو قربان کرنے کے لئے تیار نہ ہوں ۔

دودھان کیوں بنا؟

لوک سیوک سنگھ کے دودھان کا مسودہ باپ نے ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کے تیسرے پہر کو اپنی موت کے چار گھنٹے پہلے انڈین نیشنل کانگریس کے جنرل سکریٹری کو اس ہدایت کے ساتھ دیا تھا کہ وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے منظوری کے لئے پیش کیا جاوے۔ انہوں نے اپنا یہ ارادہ بھی ظاہر کیا تھا کہ میں اس دودھان پر پانچ چھ لکھ 'ہریجن' میں لکھ کر اس کے الگ الگ پہلوؤں کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ باپ کے سامنے یہ دودھان کتنی بڑی چیز تھی۔ سچ یہ ہے کہ مہینوں ہی نہیں مدتوں کے سوچ و چار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے جو اس دودھان کے روپ میں انہوں نے دیش کے سامنے رکھا۔

اس دودھان میں انہوں نے کانگریس کو یہ صلاح دی ہے کہ وہ اپنا آج کل کا سنگٹھن توڑ کر 'لوک سیوک سنگھ' کا روپ لے لے۔ کانگریس جیسی پرانی شکتی شالی اور اتنی بڑی سنگتھا کو اس طرح کی صلاح دینا بہت عجیب سا دکھائی دیتا ہے۔ اور جب ہم یہ جانتے ہیں کہ باپ ہر قدم کتنے سوچ کر اور ذمہ داری کے ساتھ اٹھایا کرتے تھے تو اس کی گہرائی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

یہ گہرا قدم باپ نے کیوں اٹھایا؟

اس فیصلے کے سمبندھ میں باپ سے اور کانگریس اور حکومت

کے سبھی بڑے بڑے نیتاؤں سے مدتوں بات چیت ہوتی رہی۔ عام طور سے یہ لوگ گاندھی جی کے اس دچار کے بالکل ورودھ تھے۔ وہ کانگریس کو توڑ دینا ملک کے لئے بہت بُرا سمجھتے تھے اس سے زیادہ بُرا اور خطرناک انھیں یہ دکھائی دیتا تھا کہ وہ دلش کا راج کسی دوسری پارٹی کے ہاتھوں میں دے دیں۔ انھیں ڈرتھا کہ دوسری پارٹیاں راج پر قبضہ پا کر اسے ٹھیک ٹھیک نہ چلا سکیں گی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے وردھا رچنا تک کا نفرس (مارچ ۱۹۴۸) میں کہا تھا کہ ”اپنے نئے دوہان سے باپو ہمیں راج گدی سے بھی نہیں بلکہ راج نیستی کے میدان سے ہی باہر لے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن بہت کوشش کرنے پر بھی ہم یہ نہ سمجھ سکے کہ آخر ہم اسے کسے سونپیں؟“

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک بڑا گہرا سوال ہے۔ اس سے پہلے بھی یہ سوال کانگریس کے نیتاؤں کو کئی بار پریشان کر چکا تھا۔ اسمبلیوں اور کونسلوں کے اندر رہ کر انگریزی راج کا مقابلہ زیادہ کامیابی سے کیا جاسکتا ہے یا ان سے باہر رہ کر اندر جانے کے بعد ان سے باہر آ کر لڑائی زیادہ کامیاب ہوگی، یا انھیں اپنے ہاتھوں میں رکھنے ہوئے، اس طرح بہت سے سوال نئے نئے پردیش کے سامنے پہلے بھی آچکے تھے۔ ان وقتوں پر باپو کی صدا ایک ہی سی رائے ہوتی تھی، وہ یہ کہ کانگریس کا ان سے باہر رہنے میں ہی زیادہ بھلا ہے۔ پھر بھی اس سمبندھ میں باپو کو کئی بار دوسروں کی رائے کے سامنے جھکنا پڑا۔ ایسے موقع پر باپو نے

یہ صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی منظوری خوشی سے نہیں مجبوری سے دے رہے ہیں، جب انگریزوں کے سے میں کانگریس کے لئے کونسلوں اور اسمبلیوں سے باہر رہنا اتنا دشمن تھا تو انگریزی راج کے چلے جانے پر، دیش کے پوری آزادی حاصل ہونے کے بعد کانگریس کے نیتاؤں کی مجھ میں راج گدی کو چھوڑ دینا کیسے آسکتا تھا۔ کانگریس کے اس گروے جھکاؤ کو جانتے ہوئے بھی اور اس جوش کو سامنے رکھتے ہوئے بھی جو راج نیک آزادی مل جانے سے دیش میں پیدا ہو گیا تھا باپو نے پھر بھی راج گدی کو چھوڑ دینے کا سوال کانگریس کے سامنے رکھ دینے کا فیصلہ کیا، اور آخر کے تک اس فیصلے پر جمے رہے۔

مجھ یہ ہے کہ جس دن سے باپو راج کالج کے میدان میں آئے تب سے لے کر آخر تک ان کے دھاروں اور آدرشوں اور کانگریس کے دھاروں اور آدرشوں میں زمین آسمان کا فرق رہا ہے۔ ہم ادھر کہہ چکے ہیں کہ کانگریس کے ساتھ بنیادی مت بھید ہوتے ہوئے بھی باپو نگ بھگت تیس سال تک انگریزی حکومت سے لڑنے میں کانگریس کی اگوائی کرتے رہے۔ اس سارے سے میں کانگریس کے بہت سے دھار رنگ ڈھنگ اور یونائیں باپو کے اصولوں، دھاروں اور یونائوں سے اٹھی تھیں پھر بھی جہاں تک ہوسکا کانگریس باپو کے اصولوں پر چلنے کی کوشش کرتی رہی۔ گو کہ یہ کوشش کھوکھلی اور ادھری ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ باپو کے مقابلے کا کانگریس کے پاس دوسرا نیتانہ تھا اور نہ ایسی کوئی یونائ تھی جس سے کانگریس جتنا کہ، اور سنگٹھن کر کے انگریزی راج سے ٹکڑے کر سکتی۔ اس لئے خوشی یا ناخوشی باپو کے بتائے ہوئے

سادھنوں کو ہی وہ استعمال کر سکتی تھی۔ اس استعمال میں یہ انھیں اتنا اول بدل اور توڑ مروڑ ڈالتی تھی کہ ان کا سارا رنگ سا بگڑ جاتا تھا اور ان سادھنوں کی آنتک اور نیتک نشیٹ ہو جاتی تھی۔ کہنے کو یہ یوجنائیں باپ کی ہوتی تھیں مگر اصلیت میں ان کی صلاحوں اور سدھانتوں کا ان میں بہت کم اثر رہ جاتا تھا۔

عجیب بات ہے کہ جیوں جیوں باپ کی طاقت کا اثر بڑھا اور ان کی کامیابیوں کے نقشے ہمارے سامنے آتے گئے تیوں تیوں دلش کے نیتاؤں اور سپاہیوں کی شردھا باپ کی اہنسا کی یوجناؤں اور ہتھیاروں میں گھٹتی گئی۔ سن ۱۹۳۲ء اور ۳۳ء کے آندھنوں کے بعد باپ اور کاجمر میں کے اصولی مت بھید نے ایک وکٹ روپ لے لیا، ان آندھنوں میں بہت سی باتیں ایسی ہوئیں جنھیں باپ ناجائز سمجھتے تھے۔ جیسے کمپیننگ میں ٹانگیں پکڑ لینا، لیسٹ کر لوگوں کو روکنا، طرح طرح کے ہنسنا کے نعرے لگانا، ہر طرح کے آدمیوں سے جیل بھرنے کی کوشش کرنا، پکڑ جانے کے ڈر سے اپنی جائیدادیں دوسروں کے نام کر دینا، کانگریس تک کو بالکل تنگ کر دینا، مقدموں میں نام ادا پتے جھوٹے بنانا، پولس کی زیادتیوں میں ”لال پگڑی ہائے ہائے!“ ”روٹی کا کٹھا ہائے!“ ہائے!!“ چلانا۔ جیلوں کے اندر جا کر ہم نے جو کارنامے کئے، ان کی سچی کہانی اگر دنیا سن پائے، تو حیران ہو جائے۔ جیل جانے والوں کی گنتی بڑھانے کے لئے ہم جو جائز یا ناجائز ترکیبیں کرتے تھے ان پر کسی کو بھی ابھمان نہیں ہو سکتا۔ چھپ کر اخباریں اور

بولیٹن نکالنے کا اور انڈر گراؤنڈ ہو جانے کا آج بھی ہمیں گھنٹہ ہر۔
ایسی ہی بہت باتیں تھیں جنہیں باپو ستیہ اور اہنسا کے خلاف
سمجھتے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں۔ اتنا ہی نہیں
کہ ہم نے ان کی صلاح نہ مانی، ہم نے اس اصول ہی سے انکار کیا کہ یہ
ستیہ اور اہنسا کے خلاف یا کانگریس کی کریڈ کے خلاف ہیں۔

کانگریس کی کریڈ میں کیوں جائز اور شانتی سے سادھنوں کے
کام میں لانے کی اجازت دی گئی ہے۔ کانگریس کی اس کریڈ کو کہ
جائز اور شانتی سے سادھنوں سے پورا سوراخ حاصل کیا جائے،
باپو نے ہی بنا کر کانگریس سے منظور کروایا تھا۔ اس کریڈ (مقصد) کے
اصول کا بدل جانا باپو نہیں سہہ سکتے تھے۔ ہم نے دعویٰ یہ کیا کہ
اوپر دی ہوئی یہ ساری باتیں جائز اور شانتی مئے ہیں۔ باپو کا
کہنا تھا کہ یہ کریڈ میری بنائی ہوئی ہے اور اس لئے ان شبہوں
کے جو معنی میں سمجھتا ہوں وہ ٹھیک سمجھے جانے چاہئیں، اور
میں نے کریڈ میں جائز اور شانتی سے مشبہ "ستیہ" اور
"اہنسا تمک" شبہوں کے لئے استمال کئے ہیں۔ لوگوں نے

ان کی بات نہیں مانی۔ آخر کار یہ معاملہ آل انڈیا کانگریس
کمیٹی کے سامنے پہنچی میں پیش ہوا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی
نے بھی باپو کی یہ بات نہیں مانی۔ اسی پر باپو کو کانگریس کی
عمری سے استعفا دینا پڑا۔ وہ کسی ایسی راج نیتیک سنستھا
میں رہنا، جس کا راستہ صاف طریقہ پر ستیہ اور اہنسا کا نہ
ہو، ٹھیک نہیں سمجھتے تھے۔

باپ کے الگ ہو جانے کے بعد کانگریس ان کے اثر سے اور بھی آزاد ہو گئی۔ اُس نے باپ کی یو جناؤں کی طرف دھیان دینا اور بھی کم کر دیا۔ باپ کے راج نیک چلے یہ محسوس کرنے لگے کہ اب ہم باغ ہو گئے ہیں اور دیش کی ذمہ داری ہمیں اپنی سمجھ اور اپنے مدھانتوں کے انوسار نبھانی چاہئے۔ سکشن سے سکشن اور گنجیمے گنجیمے موتوں پر انھوں نے باپ کی اچھاؤ اور صلاحوں کا نیک نیتی اور ہمت کے ساتھ خود درودھہ کیا، اس سب کے ہوتے ہوئے بھی باپ کانگریس کی ویسی ہی دل سے سیوا کرتے رہے۔

جو لوگ باپ کے مدھانتوں اور آدرشوں کے پریمی تھے وہ ان کے اس طریقے سے پریشان رہتے تھے۔ نہیں معلوم کتنی بار انھوں نے باپ پر یہ زور ڈالا کہ وہ اپنے مدھانتوں میں سچے دل سے دشمن رکھنے والوں کی پارٹی الگ بنائیں اور اس کو ساتھ لے کر دیش میں اپنے دھار کے انوسار سوراخ قائم ہونے کی بنیادیں ڈالیں۔ باپ جانتے تھے کہ ایسی سنتوا اور ایسے لوگوں کا ساتھ دینا جن کے اصول ان کے خلاف ہوں، جتنا کیلئے باپ کے مدھانتوں اور یو جناؤں کو پوری طرح سمجھنا ناممکن بنا رہا ہے۔ پھر بھی وہ سدا اپنی اسی نیتی پر چلتے رہے اور کبھی کانگریس سے الگ ہو کر انھوں نے اپنا دل الگ نہیں بنایا۔ یہی ان کا سو بھاؤ تھا۔ یہی ستیہ، اہنسا کا راستہ تھا اور اسی کو وہ اپنا دھرم سمجھتے تھے۔

اسی کے ساتھ ساتھ اگر انھیں ایک بار یہ یقین آجاتا تھا کہ کوئی سنسٹھا جنتا کے بھلے کے خلاف کام کرتی ہے یا جنتا کے بھلے کے لئے اس کی ضرورت نہیں رہی تو باپو اس سے الگ ہو جاتے تھے اور کوئی دوسری سنسٹھا بنا کر یا کسی نئی بنائی سنسٹھا کو بڑھا کر اپنا کام چلاتے تھے۔ ہوم رول لیگ کو انھوں نے ختم کر کے کانگریس کے لئے میدان صاف کر دیا تھا۔ ہندی سامیہ سمیلن سے الگ ہو کر انھوں نے دوسری سنسٹھا (ہندستانی پرچار سمیٹھا) سے اپنا کام چلایا تھا۔ مار می کے سٹیوگرہ آشرم کو انھوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے توڑ دیا۔ گاندھی سیوا سنگھ کو، جو کیول ان کے بھکتوں کا سنگھ سمجھا جاتا تھا، اور ضروری نہ سمجھ کر ختم کر دیا۔ ان کا دل جتنا نرم تھا اتنی ہی اس میں کڑائی بھی تھی۔ یہی کارن تھا کہ وہ ستیہ پر اٹل روپ میں جتے رہتے تھے۔ کانگریس پر سے ان کی شر دھا دنوں دن گھٹتی جا رہی تھی۔ جب تک کانگریس دیش کی آزادی کے لئے انگریزی سرکار سے لڑ رہی تھی، دیش کے لئے اس کی بہت بڑی ضرورت تھی۔ انگریزی راج کے دیش سے اٹھ جانے اور دیش کی آزادی مل جانے سے اس ماری حالت کو بالکل بدل دیا۔ سب سے بڑا اس کا اثر یہ پڑا کہ ستیہ، اہنسا، ستیہ گرہ، اسیوگ جیسی چیزوں کی کانگریس اور اس کی حکومت کو کوئی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ یہ چیزیں کانگریس کے لئے اتنی ہی خطرناک ہو گئیں جتنی یہ انگریزی سرکار کے لئے تھیں۔ باپو کے مارے مشن کا جہاں تک

اس کا راج کالج سے سمبندھ تھا، کانگریس کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ آزادی ملتے ہی دیش کی سرکار کے سامنے دوسرے دیشوں کے ساتھ سمبندھ کا سوال سب سے بڑا سوال ہو گیا اور پولس اور فوجوں کا اس راج کے لئے دہی بڑپن ہو گیا جو کچھی دیشوں میں ہے۔ اہنسا کے اصول، دھار، سادھن اور یوجنائیں دیش کے چون سے ایسی مٹ گئیں جیسے یہ کہیں تھی ہی نہیں۔ اس کے ساتھ باپو کے اثر کا کانگریس اور اس کی حکومت پر سے بالکل مٹ جانا لازمی تھا۔ آزادی مل جانے کے بعد کانگریس کے دسے دار نیتا باپو کی صلاحوں کو بے کار اور اپنے لئے ایک رکاوٹ محسوس کرنے لگے۔ بڑے سے بڑے موقعوں پر انھوں نے صلاح لینا تک بند کر دیا اور جب لیتے بھی تھے تب اگر وہ ان کی مرضی کے خلاف ہوتی تھی تو وہ اس کی پداہ نہیں کرتے تھے۔ باپو پر ان باتوں کا گہرا اثر تھا۔ وہ اس کی چرچا برابر کیا کرتے تھے۔ ان کی پرار تھنا کے پروجیوں میں بھی یہ شکایتیں موجود ہیں۔

باپو نے کچھی سمبھتا کے لئے مسند میں بھوشیہ بانی کی تھی کہ یہ اپنے دراجپار کی آگ میں آپ ہی بھسم ہو جائے گی۔ ان کی اس بھوشیہ بانی کو بچھم کی دو بڑی لڑائیوں نے قریب قریب پورا کر دیا۔ جو کچھ رہ گیا ہے اس کے لئے تیسری کی تیاری بڑے زور شور سے ہو رہی ہے۔ اسی طرح انھوں نے اس دیش کے لئے یہ بھوشیہ بانی کی تھی کہ اگر پارلیمنٹی راج جہاں ہم گیا تو دیش بالکل برباد ہو جائے گا۔ کچھی سمبھتا سے بھی

کہیں زیادہ ان کا یہ خیال سچا ثابت ہوا۔ کناڈی پانے اور پارسی بلج جانے کی آشنائے ہمارے اونچے اونچے، نیک سے نیک، تیاگی اور تجربے کار قیادتوں کو اتنا موہ لیا کہ انھوں نے اس آزادی اور حکومت کو ایسی قیمت پر خریدا جو آج تک کسی دیش کو دینی نہیں پڑی تھی۔ دیش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آزادی ملی، نتیجہ یہ ہوا کہ دیش کی جیتی جاگتی جنتا بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ خیال یہ تھا کہ اس بنٹوارے سے ہندو اور مسلمانوں کی دشمنی ختم ہو جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دیش اور ایک راج کی جگہ دو دیش اور دو راج ایک دوسرے کے دشمن ٹکڑے ہو گئے۔ جہاں تک اپنے دیش کے اندر کے ہندو اور مسلم مسابندوں کا سوال تھا وہاں تک پھوٹ کی ساری پرانی بنیادیں اپنی جگہ پر بنی رہ گئیں اس سے بڑی مصیبت آج تک سنار میں کسی دیش پر نہیں آئی تھی۔ یہ ہمارے پارسیٹی راج پانے اور جانے کی شروعات تھی۔

اس گھٹنا نے باپو کی ساری پرانی کوششوں اور جیتوں کو ہی نہیں بلکہ ان کے جیون کے مشن ہی کو جلا کر خاک کر دیا۔ ان کے جیون کی گہری سے گہری بنیادیں ہل گئیں مگر لوگوں میں ہیشہ خیال عام طور پر بھیلہ ہوا ہے کہ اس بنٹوارے میں باپو کا بھی ہاتھ تھا۔ اس خیال کی بنیاد اس دشوار پر ہے کہ اگر باپو سچ روکنا چاہتے تھے تو اس طرح کی گھٹنا ان کی مرضی کے خلاف اس دیش میں ہو رہی نہیں سکتی تھی۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ باپو نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی بیٹھک میں لوگوں کو جو صلاح دی تھی اس سے یہ خیال اور بھی بڑھ گیا۔ باپو نے صاف کہا تھا کہ میں ہمیشہ سے

بنٹوارے کو رد کرنا چاہتے ہو تو تمہیں پہلے پنڈت جواہر لال، سردار پیل اور ان کے ساتھیوں سے زیادہ تیاگی، ایماندار اور تجربے کا رنیتا ان کی جگہ لینے کے لئے ڈھونڈھ لینے چاہئے۔ کیوں کہ تمہارے اس بنٹوارے کو رد کر دینے کے بعد یہ لوگ درنگ کمیٹی یا راج کی کرسیوں پر نہیں رہ سکیں گے۔ ان لوگوں نے باپو سے کہہ دیا تھا کہ لوگوں نے ہمارا کہنا نہ مانا تو ہم درنگ کمیٹی یا سرکار میں نہیں رہیں گے۔

یہ اس سے کی بھی بھی حالت تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی بنٹوارے کو رد کر سکتی تھی، پر اس کے سامنے سہاں یہ تھا کہ اس کا دیش پر کیا اثر پڑے گا۔ دیش کے بنٹوارے نے ایک بڑا خطرہ کھڑا کر دیا تھا۔ اس خطرے سے بچنے کے لئے وہ اگر درنگ کمیٹی کو اور منتری منڈل کو توڑ کر نئی کمیٹی بناتی جس میں پنڈت نہرو، سردار پیل اور ان کے ساتھی نہ ہوتے تو دیش کا اتنا بڑا سنگٹھن اور شکست جو اس کی ساری درودھی شکستوں کا ۴۰ سال سے مقابلہ کر رہی تھی، ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی۔ اس سے ان کی خالی جگہ کو ٹھیک ٹھیک بھر سکتا کوئی آسان بات نہ تھی۔ اگر یہ جگہ ٹھیک نہ بھر سکتی تو ہو سکتا تھا کہ دیش میں اراجکتا کا ایسا طوفان آجاتا جو مدتوں کے لئے دیش کی آزادی اور ٹکڑاؤ راج کی امیدوں کا خاتمہ کر کے پھر سے دیشیوں کا ادھیکار جما دیتا: اس حالت میں باپو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو کوئی بھی دوسری صلاح دینے کی ذمہ داری اپنے اپنے نہیں لے سکتے تھے۔ ان کی اس صلاح کی اس بنا پر بنٹوارے کی ذمہ داری ان پر ڈالنا بالکل بے جا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس سے باپو راج نیقی میں بالکل بے

بس وہ رہے تھے۔ ۱۹۴۲ء کے آندولن کے بعد سے ان کا اثر کانگریس پر بڑی تیزی کے ساتھ گھٹ رہا تھا کیوں کہ کانگریس کے بہت سے نیتا اور کاریہ کرتا اب باپو کے اصولوں اور پروگراموں کا کھٹا دھندہ کرنے لگے تھے۔ ان حالتوں کو دیکھ کر باپو نے کانگریس کو یہ صلاح بھی دی تھی کہ وہ اپنے کریڈ (مقصد) کو بدل لے اور اس میں سے ”جائز“ اور ”شانخی“ شعبوں کو نکال دے۔ باپو نے یہ بھی صلاح دی تھی کہ کانگریس اپنے ممبروں اور ادھیکاریوں کے لئے کھادی پہنتا ضروری نہ رکھے۔ جہاں تک حکومت کا سمبندھ تھا اس کے سب کام کھٹے طور پر ہر بات میں باپو کے آدرشوں اور اصولوں کے خلاف جا رہے تھے۔ فوجوں اور پولیس پر خرچہ اندھا دھندہ بڑھ رہا تھا۔ دیش کے بھتیجی (انکام میں برٹش سرکار سے زیادہ بڑے پیمانے پر گولیوں اور ڈبچوں کا پروگ ہو رہا تھا۔ باپو کہتے تھے کہ اگر تم بنا پولیس اور فوج کو اس طرح استعمال کئے اس امان قائم نہیں کر سکتے تو تمہیں حکومت سے استعفا دے دینا چاہئے۔ پر ان کا یہ کہنا ”نقار خانے میں طوطی کی آواز“ کے سمان تھا۔ فوجی راج کے ساتھ ساتھ مشین گج جلدی سے جلدی دیش میں لاسنے کی چاروں طرف دھوم مچی ہوئی تھی۔ حکومت اپنے سارے سادھن اور شکتی اس میں لگا رہی تھی۔ ”نیشنلائزیشن“ کا مطلب ہوتا ہے دیش کے بڑے بڑے دھندھوں پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہونے کی جگہ انھیں نیشن کے یعنی راشٹر کے ہاتھوں میں سونپ دیا جائے۔

اس میں راشٹر کا مطلب لیا گیا سرکار اور اس نیشنلائزیشن نے دیش کی ہر ضرورت کی چیز کو کنٹرول کر لینے کا رُپے لیا تھا۔ اس کا اثر دیش کے منگھ چین اور سدا چار کو طاعون اور پلگ کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ باپو دیش میں آتم بل اور سوادھین (اپنے پیروں پر کھڑا ہونا) کی شکتی پیدا کرنے کے لئے ہر گاؤں کو ایک آزاد ریپبلک بنادینا چاہتے تھے۔ اس کے خلاف حکومت ہٹلر اور سولینی کی طرح سبھی شکتیوں اور سادھنوں کو اپنی مٹھی میں کر لینے پر تلی ہوئی تھی۔ برٹش راج کی فضول خرچی اور شاہی شوکت کانگریس سرکار کو درشے میں ملی تھی، اور وہ اس پتھر سے کسی طرح باہر نکلنے کو تیار نہ تھی۔ سرکار کا اثر سارے کانگریس سنگٹمن پر پڑے بنا نہیں رہ سکتا تھا اور کانگریس کا اثر سارے دیش پر پڑنا لازمی تھا۔ اس لئے جسے دیکھو وہ دولت اور طاقت کی کھوج میں اُچھٹ اور اونچٹ سبھی طریقوں سے اپنا مطلب پیدا کر لینے کی کوشش میں ڈوبا ہوا تھا۔ طاقت اور دولت تو ملک میں بنی تلی ہوتی ہے اور اس کے امیدوار ان گنت۔ اس لئے کانگریس بلکہ سارا دیش گندی سے گندی پارٹی بازیوں کا کھانوا بن گیا تھا۔ دیش میں بے ایمانی، دغا فریب، رشوت اور طرح طرح کی لوٹ کا بازار گرم تھا۔

یہ سارا گھر چھوٹک تاشہ باپو کی آنکھوں کے سامنے برابر ناچتا رہتا تھا، جب تک برٹش راج قائم تھا انھیں اس حالت سے کھلی اور سیدھی ٹکڑ لینے کا موقعہ نہیں تھا۔ آزادی ملتے ہی ملک کے ہٹلر سے بڑے وہ بھینکر حالت پیدا کردی کہ جس سے باپو

کے لئے کسی دوسری طرف دھیان دینا بالکل ناممکن ہو گیا۔ اس حالت سے سیدھی اور آخری ٹکڑے لینے کا خیال ان کے دل سے کبھی دور نہیں ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے اسی خیال نے ان کے لوک سیوک سنگھ کا بڈپ لیا اور اسے جنم دینے کے لئے انھوں نے اپنا آخری دو دھان بنایا۔

اس دو دھان کو غور سے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ باپو اس کے بنانے کے لئے طے کر چکے تھے کہ یا تو کانگریس اور اس کی حکومت پوری طرح اپنے غلط راستوں کو چھوڑ کر دیش اور دیش کی بھیتا کی بھی رکشا کے مارگ پر چلے، ادھر چھوڑ کر سچے دھرم کا چھتہ پکڑے اور نہیں تو باپو اس سے الگ ہو کر اپنی ساری سلطنتی ان کو غلط راستے پر چلنے سے روکنے میں اسی طرح لگا دیں گے جس طرح انھوں نے انگریزی سرکار کے آئینک اور انیایوں کو مٹانے میں لگائی تھی۔ لوک سیوک سنگھ کی یوجنا کانگریس اور اس کی حکومت کے لئے باپو کی آخری نیک صلاح تھی۔ اس کے ایک ایک شبد سے باپو کے اپنے دلی ارادوں کی بھلک صاف نظر آتی ہے۔

اس دو دھان کو انڈین نیشنل کانگریس کے جنرل سکریٹری کو دینے کے چار گھنٹے بعد ہی باپو کا دیہانت ہو گیا۔ ایشور کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ آپ اپنے اس پرن کو پورا کریں۔ لیکن اس دو دھان کے اس طرح جیتے رہنے کا پر بندھ ہو جانا، یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ ایشور اسے باپو کے ساتھ مارنا نہیں چاہتے تھے۔ دیش میں ایسی زہریلی ہوا پیدا ہو گئی تھی کہ جسے باپو کی قربانی کے سوا دوسری کئی کوئی اور شکتی بدل نہیں سکتی تھی۔ یہ حالت نہ

بدلتی تو باپو کے ودھان کے لئے دیش میں مدتوں تک کوئی جگہ ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ باپو نے اپنا فرض ادا کر کے اس ودھان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے زمین تیار کر دی تھی۔ اب اسے سمجھنے، چلانے اور کامیاب بنانے کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جو باپو سے پریم رکھتے تھے اور جو ان کے آدرشوں، سدھانتوں اور یوجناؤں کو اپنے دیش اور سنسار کے لئے برکت سمجھتے ہیں۔

ودھان کا مسودہ

یہاں پر ہم باپو کے نوک سیوک سنگھ کے ودھان کا لفظی ترجمہ، جس روپ میں انہوں نے اسے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے رکھنا چاہا تھا اور جس میں یہ ۱۵ فروری ۱۹۴۸ء کے 'ہیرجن' میں چھپا ہے، نیچے لے رہے ہیں۔

ودھان کا ترجمہ

ہندستان کے دو ٹکڑے تو ہو گئے، پھر بھی انڈین نیشنل کانگریس نے راج کاجی آزادی حاصل کرنے کے جو سادھن نکالے تھے ان سادھنوں سے ہندستان نے راج کاجی آزادی حاصل کر لی ہے، اس لئے کانگریس کی آج کل کی شکل صورت کا یعنی اس صورت کا جس میں وہ پرچار کا ایک ذریعہ اور پارلیمینٹی مین بن گئی ہے۔ اب کوئی کام نہیں رہ گیا ہے۔ ہندستان کو اب بیڑوں اور قصبوں کا خیال ہٹا کر سات لاکھ گاؤں کے لئے سماجی (سوشل)

سدا چاری (مورل) اور مالی (اکونایک) آزادی حاصل کرنی ہے ۔
 ہندستان جیسے جیسے اپنے اس من راج کے کش کی طرٹ بٹھے
 گا ویسے ویسے سول یعنی مغری طاقت فوجی طاقت کے اوپر
 قابو پائے کے لئے ضرور پوری پوری ٹکڑے گی ۔ راج کا جی پارٹیوں
 اور فرقہ دارانہ سنگھاؤں کی لاگ ڈانٹ ہندستان کو تندرست
 نہیں رہنے دے سکتی ۔ ان سے دیش کو بچا کر رکھنا ہی ہوگا ۔ ان
 کارنوں سے اور اسی طرح کے دوسرے کارنوں سے آل انڈیا کانگریس
 کیٹی موجودہ کانگریس سنگٹھن کو توڑ دینے اور نیچے کھٹے قاعدوں کے
 انوسار لوک سیک سنگٹھ کا سندھ روپ لینے کا فیصلہ کرتی ہے ۔
 موقع کی ضرورت کے مطابق ان نیوں میں اول بدل کیا جاسکے گا ۔
 ہر ایسے پانچ بالغ مردوں یا عورتوں کی ایک پنچائت ، جو یا
 تو گاؤں کے ہوں گے یا جھکے من میں گاؤں کی لگن ہوگی ، ایک
 اکائی مانی جائے گی ۔

اس طرح کی دو پاس پاس کی پنچائتیں مل کر اپنے میں سے ہی چنے
 ہوئے ایک نیتا کے ادھین ایک کام کرنے والا جتھا بنائیں گی ۔
 جب اس طرح کی سو پنچائتیں ہو جائیں گی تو ان کے پچاس
 پہلے درجے کے نیتا اپنے میں سے ایک کو دوسرے درجے کا نیتا
 چنیں گے ۔ اسی طرح ہوتا رہے گا ، اس پنج پہلے درجے کے نیتا
 دوسرے درجے کے نیتا کے ادھین کام کریں گے ۔ دو دو سو پنچائتوں
 کے پاس پاس کام کرنے والے گردہ بنتے رہیں گے ، جب تک کہ یہ
 سارے ہندستان میں نہ پھیل جائیں ۔ بعد کی پنچائتوں کا ہر گردہ پہلے
 گردہ کی طرح اپنے میں سے دوسرے درجے کا ایک نیتا چن لینگا ۔

دوسرے درجے کے سب نیتاں کر سارے ہندستان کے لئے سیوا کریں گے اور الگ الگ اپنے اپنے علاقوں کے لئے سیوا کریں گے۔ دوسرے درجے کے نیتا جب کبھی ضرورت سمجھیں گے اپنے میں سے ایک کو 'سردار' چن سکیں گے جو جب تک چاہے گا سب گردہوں کی قاعدے بندی کرے گا اور ان کی آگوائی کرے گا۔

(چوں کہ صوبے یا ضلع ابھی آخری طور پر نہیں بنے ہیں اور ابھی ادل بدل رہے ہیں، اس لئے سیوکوں کے اس گروہ کو صوبہ یا ضلع کونسلوں میں بانٹنے کی کوشش نہیں کی گئی، اور سارے ہندستان کے اوپر ادھیکار اس گروہ یا ان گردہوں کو دیا گیا ہے جو اس سیمے تک بن چکے ہوں۔ یہ بات دھیان میں آجانی چاہئے کہ سیوکوں کے اس دل کو جو کچھ ادھیکار یا طاقت ملے گی وہ اس سیوا سے ملے گی جو وہ خوشی اور سمجھداری کے ساتھ اپنے مالک کی کریں گے۔ ان کا مالک سارا ہندستان ہے۔)

۱۔ ہر کام کرنے والے کو اپنے ہاتھ کے کتے سوت کی یا آل انڈیا چرخہ سنگھ کی تصدیق کی ہوئی کھادی پہننے کی عادت ہونی چاہئے اور یہ ضروری ہے کہ وہ نشے کی چیزوں سے بالکل پرہیز کرتا ہو۔ اگر وہ ہندو ہے تو یہ ضروری ہوگا کہ اس نے اپنی نجی زندگی میں یا اپنے کٹب میں ہر صورت اور ہر شکل میں چھوڑا چھوٹ کو چھوڑ دیا ہو، یہ بھی ضروری ہوگا کہ اسے ساپیراٹنگ ایکٹ (فرقہ دارانہ اتحاد) کے آدرش میں دشو اس ہو، سب دھرموں کے لئے اس میں برابر کا آدر اور مان ہو اور نسل، دھرم یا مرد عورت

کے فرق کا خیال نہ کرتے ہوئے سب کو برابر کے موقع ملے اور سب کا برابر کا درجہ سمجھے جانے میں بھی اسے دشواری ہو۔
۲۔ وہ اپنے ادھیکار کے اندر کے ہر گاؤں والے سے ملے جملے گا۔

۳۔ وہ گاؤں والوں میں سے کام کرنے والے بھرتی کرے گا، انہیں کام کرنا سکھائے گا اور ان سب کا رجسٹر رکھے گا۔
۴۔ وہ اپنے روز روز کے کام کا روزنامہ لکھ کر رکھے گا۔

۵۔ وہ گاؤں کا اس طرح سنگٹھن کرے گا کہ ہر گاؤں اپنی کھیتی اور دستکاری کے ذریعے اپنے پیروں پر خود کھڑا ہو سکے اور اپنا کام اپنے آپ چلا سکے۔

۶۔ وہ گاؤں کے لوگوں کو صفائی رکھنے اور تندرست رہنے کی تعلیم دے گا اور گاؤں والوں میں تندرستی کے بگڑنے اور بیماری پھیلنے کو روکنے کے لئے سب تدبیریں کرے گا۔

۷۔ وہ ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی طے کی ہوئی نیتی کے انوسار نئی تعلیم کے ڈھنگ پر جنم سے لے کر موت تک گاؤں والوں کی تعلیم کا انتظام کرے گا۔

۸۔ وہ اس بات کو دیکھے گا کہ جن لوگوں کے نام ستانوں و دھڑوں کے رجسٹر میں درج ہوتے سے رہ گئے ہیں وہ اس رجسٹر میں ٹھیک ٹھیک درج کرائے جائیں۔

۹۔ جن لوگوں میں ابھی تک دھڑ بننے کی قانونی یوگتا نہیں ہے

انہیں وہ اس بات کے لئے بڑھاوا دے گا کہ وہ اس یوگیتا کو حاصل کریں تاکہ انہیں دوٹ کا ادھیکار مل جاوے۔

۱۰۔ اوپر کے کاموں کے لئے اور دوسرے ایسے کاموں کے لئے جو سے سے پر ان میں بڑھادے جائیں، سنگھ کے بنائے ہوئے قاعدوں کے مطابق وہ اپنا فرض ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کے لئے اپنے کو خود سامنے گا اور یوگیہ بنائے گا۔

سنگھ نیچے لکھی سوادھین سنتھاؤں کو اپنے ساتھ ملائے گا۔

- (۱) آل انڈیا جرخہ سنگھ
- (۲) آل انڈیا گرام ادلوگ سنگھ
- (۳) ہندستانی تعلیمی سنگھ
- (۴) ہریجن سیکر سنگھ
- (۵) گز سیدا سنگھ

دھن

اپنے آدیشیہ کو پراکریے کے لئے سنگھ گاؤں والوں سے اور دوسرے لوگوں سے دھن جمع کرے گا جس میں خاص زور اس پر رہے گا کہ غریب لوگوں سے ہمیشہ جمع کیا جاوے۔

م۔ کی۔ گاندھی

دوہان کی پرستاشنا (تمہید)

یہ پرستاشنا ان درد بھرے خبدوں سے شروع ہوتی ہے۔
 ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس سے بڑا حادثہ باپو کے جیون میں
 کوئی دوسرا نہیں ہوا تھا۔ لازمی تھا کہ ان کے دل اور دماغ پر گہرے سے
 گہرا اثر ڈالے۔ یہ بھی لازمی تھا کہ انہیں اس بنواریے میں اپنے سارے
 کوششوں، اصولوں اور کام کرنے کے طریقوں کا خاتمہ دکھائی دیتا ہو اگر تیس
 سال کی ستیہ اور اہنسا کی لڑائی سے یہ نتیجہ پیدا ہو سکتے ہیں تو ان کے
 وہ سارے دعوے، جو وہ آتم بل اور ستیاگرہ کے بارے میں دنیا کے
 سامنے پیش کرتے رہے تھے، بالکل بے بنیاد تھے۔ اگر وہ بے بنیاد نہیں
 تھے تو یہ صورت کیوں پیش آئی؟ باپو کے سامنے یہ سوال سب سے اہم
 سوال تھا اور انہوں نے اس دوہان کے پہلے جلے میں اس کا پورا
 جواب دیدیا ہے۔ ان کے شبدوں سے یہ صاف چمکتا ہے کہ آزادی کی
 قیمت یا رشوت کے روپ میں ہم نے دیش کے دو ٹکڑے کئے ہیں۔ ستیہ
 اور اہنسا کے لحاظ سے اس سے بڑی بد اخلاقی (درا چار) نہیں ہو سکتی
 اور جب ہم یہ سوچیں کہ کانگریس کے بڑے سے بڑے نیتا آخر وقت تک
 برابر ملک کو یہ دشواریاں دلاتے رہے تھے کہ کسی صورت میں بھی وہ دیش
 کا بنواریہ نہیں سمجھ سکیں گے تو اس بد اخلاقی کی سیما ہی اور بھی بڑھ
 جاتی ہے۔ لیکن دراصل درا چار، اس ستیہ اور اہنسا کی جان
 بوجھ کو پامالی کرنے کا ٹومہ دار کون ہے؟ اس کا جواب ایک
 ہو سکتا ہے کہ یہ ذمہ داری پوری پوری باپو کی ہے۔ جن کے

اصولوں اور طریقوں پر کانگریس کام کر رہی تھی اور جو اس کے اصل اور
پتے رہنا تھے۔ جیسا ہم نے کہا ہے، اس غلط فہمی کا بھاب باپو نے
اپنے اس دھان کے شروع کے فقرے میں دیا ہے۔

”دیش کے دو ٹکڑے تو ہو گئے، پھر بھی انڈین نیشنل

کانگریس نے راج کا جی آزادی حاصل کرنے کے جو
سادھن نکالے تھے ان سادھنوں سے ہندستان نے
آزادی حاصل کر لی ہے!“

اتنے صاف شبہ میں ہندستان کی تیس سال کی سیاسی کشمکش
اور لڑائی میں جو اصول اور طریقے استعمال کئے گئے ان کی پوری
ذمہ داری سے باپو نے اس سے پہلے کبھی اتنے صاف اور کھلے
شعبدوں میں اپنے آپ کو الگ نہیں کیا۔ باپو کسی معاملے میں
اپنی ذمہ داری قبول کرنے سے ڈرتے تھے انسان نہیں تھے۔ ذمہ داریاں
قبول کرنے کی جو شاندار مثالیں انھوں نے دنیا کے سامنے پیش
کی ہیں انھیں انسانی دنیا آسانی سے بھلا نہ سکے گی۔ اس سے
اس ذمہ داری سے باپو کو اپنے کو الگ کرنے پر ہمیں اور بھی
گہری نگاہ ڈالنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ہمیں یہ دھیان
رکھنا چاہئے کہ ساری دنیا کے دل پر یہ خیال بھرا ہوا ہے کہ کانگریس
باپو کے اصولوں اور طریقوں پر چلتی تھی اور انھیں سے آئے اتنی
شاندار جیت ہوئی کہ بنا خون خرابی کے اور اپنی مرضی سے انگریزی
سرکار دیش سے چل گئی۔ باپو کی اس سے زیادہ کامیابی اور کیسا

ہو سکتی ہے۔ لیکن باپو اس کو اپنی سب سے بڑی ہار سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کا اس میں کوئی ہاتھ نہ تھا۔ جو کچھ کیا ہے کانگریس نے اپنی پالیسی اور اپنے طریقوں سے کیا ہے اور اس واسطے اس ساری برائی بھلائی کی ذمہ دار ہے۔

ہم پہلے دکھا چکے ہیں کہ کانگریس اور باپو کے بیچ ہمیشہ کتنے گہرے مت بھید رہے اور کیسے کانگریس ان کی صلاحوں اور اصولوں کو تیاگ کر وہ راستے اپناتی رہی جسے باپو اسیہ اور اہنسا کے راستے کہتے تھے۔ لیکن کانگریس کے نیتاؤں کے دل میں باپو کے لئے اتنا گہرا پریم اور اتنی شردھا تھی اور وہ انھیں اسی پریم اور شردھا کے ساتھ اس طرح اپنا رہنما بنایا کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اصول اور عمل میں ان کے خلاف چلنے پر اتنے خوبصورت اور گہرے پردے ڈالتے رہتے تھے کہ دنیا یہ محسوس نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کس حد تک باپو کے سارے اہنسا تک اصولوں اور سادھنوں کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ اسی لئے ہندستان اور دنیا کے لوگوں کو سدا اس بارے میں گہری سے گہری غلط فہمیاں ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن اس بنیادی بے اصولی اور غلط طریقوں کا آخری نتیجہ اتنا بھیانک اور شرمناک ہوا کہ باپو کو اس سارے راز کی اصلی حقیقت کو کھول کر دنیا کے سامنے رکھ دینے کی سخت ضرورت محسوس ہوئی۔ باپو کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ ایسا نہ ہو کہ آنے والی دنیا کی پیڑت اور مظلوم قومیں کانگریس کے راستے کو سستیہ اور اہنسا کا راستہ سمجھ کر اپنی آزادی اور مکتی کے لئے جو راہ اپنائیں ان سے اُن کے لئے

ایسے ہی بھیانک خطرے اور بربادیاں پیدا ہو جائیں۔ اسی لئے اپنی اس آخری وصیت میں باپ نے اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے ضمانت کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی ان کی اس شکشا کی طرف سے آنکھیں چراتا ہے یا بے پرواہی برتتا ہے تو اس کی ذمہ داری خود اُسی پر ہے۔ باپ ہمیشہ اپنے اس خیال کو ہر موقع پر اپنے طریقے پر ظاہر کرتے رہتے تھے۔ بد قسمتی سے کانگریس نے کبھی باپ کی شکشا کے اس پہلو پر دھیان نہیں دیا۔ اس کا آخر کار نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کی سب سے بڑی جیت اس کے لئے بھیانک بربادیاں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ اپنے ساتھ لائی۔ اس کا جتنا دکھ اور جتنا درد باپ کو تھا، کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا تھا۔ اُسی نے انھیں اس دو دھان کے بنائے پر مجبور کیا جس میں انھوں نے کانگریس کو اُس کی غلطیوں پر آخری بار چٹاؤنی دی ہے اور کانگریس اور ریش کو وہ راستہ دکھایا ہے جس پر چل کر اپنے گناہوں کا جت کچھ برا بھلا ہو سکتا ہے۔

کانگریس کے کام کے طریقوں سے اپنے آپ کو بری کر کے باپ نے اس کے سامنے وہ نتیجے پیش کئے ہیں جو اس کے غلط کاموں سے پیدا ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ ان سے خود اس کا برا حال ہو گیا ہے۔ ان کے شدید ہیں۔

”کانگریس کی آج کی شکل و صورت کا، یعنی اس صورت

کا جس میں وہ پرچار کا ایک ذریعہ اور پارلیمنٹری مشین بن گئی ہے“

باپو کا کہنا ہے کہ راج کا جی آزادی پانے کے بعد، جو دنیا کی سب سے بڑی طاقت سمجھی جاتی ہے، کانگریس دلش کی سچی یوک اور سردھارک بننے کی جگہ پارلیمینٹی حکومت چلانے کی مردہ مشین اور اس کا گٹھ گٹھ کرنے کا سادھن بن کر رہ گئی ہے۔ آخر یہ درد ناک تبدیلی اس میں کیوں پیدا ہو گئی۔ اس کا کارن یہ ہے کہ راج کا جی آزادی کا صحیح استعمال کرنا اس کے بس سے باہر ہو گیا ہے۔ آزادی ایک فکھتی ہے جس سے اپنی قابلیت کے انوسار اچھے اور برے دونوں کام لئے جاسکتے ہیں۔ یہ خود کوئی نعمت نہیں ہے۔ اس کا صحیح استعمال اچھے سے اچھے نتیجے پیدا کر سکتا ہے۔ اس کا غلط استعمال اسے دنیا کا سب سے بڑا خطرہ بنا سکتا ہے۔ اس لئے اگر کانگریس کا آرشی اخلاق اور سدا چار ہوتا اور اس نے باپو کے سندیش کے صحیح طبع پر سمجھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کی ہوتی تو وہ اس طاقت کو پانے کے بعد اس کا صحیح استعمال کر سکتی تھی۔ اس نے اپنی اس زبردست فکھتی کو اور اپنی سادھنوں اور سادھنوں کو جو اس نے اس کی بھیدت کر دئے، یورپ کی سٹیٹھان سبھیتا کی ازھی پیروی میں خرچ کرنا اپنا پیشہ بنایا اور اس راہ میں چلا دناش کاربہ (ہاکت آہن) قدم یہ اٹھایا کہ بنا ضروری سدھار اور تبدیلیوں کے پارلیمینٹی حکومت قائم کر کے اُسے ایک بے جان مشین کی طرح چلانے لگی۔ باپو کی تیس سال کی اس خشکشا کو کہ چار سہ دلش کے لئے اگر زری سرکار اتنا بڑا خطرہ نہیں ہے بلکہ ہماری اگر ذیت ہے، ہماری راج کا جی غلامی نہیں ہے بلکہ ہماری

سدا چاری، اگر تھک اور نیک غلامی ہے، اُس نے ٹھیک اس سہتے پر جب کہ اس سے پورا فائدہ اٹھانے کا سہ آیا، اس طرح بھلا دیا جیسے اس دیش میں یہ خیال کبھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دیش کے دو ٹکڑے ہو گئے، اسی کا نتیجہ ہے کہ دو ٹکڑے ہونے کے بعد وہ ساری مصیبتیں اور خطرے جن کو دور کرنے کے لئے یہ ٹکڑے کئے گئے تھے۔ اسی جگہ پر آج بھی پہلے کی طرح بلکہ اور بھی خراب مدپ میں باقی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ دیش میں وہ نئی حالتیں پیدا ہو رہی ہیں کہ اگر اب بھی اس بچھی پارلیمنٹی حکومت کے طریقوں میں سدھار نہ کیا اور بچھی سبھیتا کے اصولوں، طریقوں اور پالیسی کو نہ چھوڑا تو بچھی غلامی کا جوا دوبارہ دیش کے کندھے پر آجائے گا اور جتنا، کانگریس اور کانگریسی سرکار سب ان مصیبتوں میں پڑ جائیں گی جن کے مقابلے میں انکی بچھی بربادی ناند پڑ جائے گی۔ بچھی سبھیتا کی اندھی پیروی سے دیش میں نہ ہونے دیتے پیدا ہوں گے جو کلج یودپ میں پیدا ہو رہے ہیں۔ بدکاری، دغا فریب، نفرت، خود غرضی، لوٹ مار اور ہر طرح کے گھروں جھگڑے جو یودپ کی تہذیب کی خاصیت ہیں، دیش میں اپنا گھر بنالیں گی۔

چلین اور برا وغیرہ کی سی حالت اس دیش میں بھی پیدا ہو سکتی ہے اس لئے کانگریس کو اس ماسے کو چھوڑ دینا چاہئے۔ اُسے یہ محسوس کرنا چاہئے کہ وہ اپنے پُرانے راستے سے بالکل ہٹ گئی ہے اور اس لئے اپنے موجودہ روپ میں کسی معنی میں بھی دیش کے لئے کار آمد نہیں رہی۔

باپو کے شبہ یہ ہیں۔

”کانگریس کی آج کل کی شکل صورت کا، یعنی اس صورت کا جس میں وہ پرچار کا ایک ذریعہ اور پارلیمنٹی مشین بن گئی ہے، اب کوئی کام نہیں رہ گیا!“

سوال یہ ہے کہ باپو کی نگاہ میں کانگریس کا پُرانا آپ یوگ یا کام کیا تھا اور اب وہ کیوں اور کیسے ختم ہو گیا۔ باپو کی نگاہ میں کانگریس کا پُرانا آپ یوگ یہ تھا کہ چاہے کتنے ہی غلط طریقے سے کیوں نہ ہو، اس نے اہنسا ترک ڈھنگ پر باپو کے ستیہ گروہ کے پروگرام کو بڑی ہی بہادری، بے غرضی اور سرفروشی کے ساتھ چلایا۔ اس نے برٹش سرکار کی غلطیوں، نا انصافیوں اور اتیاچاروں سے جتنا کو بچانے میں کڑی مصیبتیں بھیلیں اور نقصان اٹھائے اور اپنے اس بے مثال تیاگ سے لوگوں میں اتنی بیداری، اتنی شکتی اور اتنا ایک پیدا کر دیا جس نے ودیشی راج کی بنیادیں دیش سے اکھاڑ ڈالیں۔ اس کے جیون کا سب سے اہم اور خاص پہلو یہ تھا کہ وہ حکومت کے سدھار کا سب سے بڑا ذریعہ تھی اور حکومت کے اتیاچاروں اور انیایوں سے دیش داسیوں کو بچانے کا سب سے بڑا سادھن تھی۔ اُس میں تیاگ تھا، اُس میں جنتا کی سیرا کا بھاؤ تھا، اُس میں ہمت تھی اور جنتا کو ابھارنے اور اُسے اپنے مقصدوں کے لئے سنگٹھت کرنے کی طاقت تھی۔ انھیں خوبیوں کے کارن ستیہ اور اہنسا کے راستوں سے بھٹکتے ہوئے بھی جب کبھی وہ باپو سے کسی قسم کی

بھی مدد چاہتی تھی تو وہ ہمیشہ اُس کی زیادہ سے زیادہ مدد کرتے تھے۔ پھر سوال یہ ہے کہ آخر اب کیا ہوگا۔ باپ کیوں کہتے ہیں کہ کانگریس کا دیش کی بھلائی کے لئے اب کوئی کام نہیں رہ گیا۔ اس کا کارن یہ ہے کہ آزادی مل جانے سے کانگریس کی حالت میں ایک زبردست انقلاب ہو گیا۔ اُس نے سر سے پاؤں تک اپنا چولا ہی بدل ڈالا۔ وہ سارے گن اور ساری خوبیاں جنھوں نے اُسے ایک خاص جگہ دے رکھی تھی، اُس کی زندگی میں سے بالکل ختم ہو گئیں۔ وہ پہلے دیش کی سیوک تھی اب اُس کی مانک بن گئی۔ بھکھاری کی جگہ وہ راجہ بن گئی۔ تیاگی کی جگہ وہ بھوگی بن گئی، جتنا کو راج کے انیاویں سے بچانے کی جو ایک زبردست ڈھال تھی وہ اب خود جتنا پر لاشیویں اور گویوں کی بوچھاڑوں کو جگہ جگہ ضروری بتانے لگی۔ وہ جس طرز حکومت یا شاسن پر دھتی کو دنیا کی بدترین پر دھتی کہتی تھی، جیسے وہ بالکل ناکارہ، حماقت اور حماقت سے بھری اسے ایمان اور بدینت کہتی تھی، آزادی پاتے ہی وہ اُسی انگریزی شمنشا بیت کی مری ہوئی لاش میں اس طرح سما گئی جیسے وہ اُس کا جسم ہو اور انھیں انگریزی انسروں اور نوکروں سے جن کا دل و دماغ، شریر اور استرا بچھی راج کی غلامی کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے، دیش کی سیوا اور رکشا کے لئے لگا دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ پرانی حکومت کی تفوں خرمچوں، رعب داب، شان شوکت اور آدمبروں کو اُسی طرح اپنا لیا جیسے کوئی جیتا ہوا ماحہ کسی ہارے ہوئے راجہ کی ساری چیزوں کو اپنی ملکیت بناتا ہے۔ جن ساری باتوں کو مٹانا اُس نے اپنا مقصد

بنایا تھا۔ اُسے اپنا آج اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہے۔ اس زبردست اور دانش کاری تبدیلی کے بعد اُس میں اپنی پُرانی خوبیاں کیسے باقی رہ سکتی تھیں۔ باپو اُس کی نیک اور روحانی گراؤٹ کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اُن کی دلی خواہش تھی کہ کانگریس کے پُرلنے جذبے کو پھر کسی طرح جگا سکیں۔ اسی لئے اپنے اس پرستائو میں انھوں نے اُسے اپنے پرانے راستے کو چھوڑنے کی صلاح دی ہے اور آنے والے خطروں سے اُسے آگاہ کیا ہے۔

باپو نے اُسے یاد دلایا ہے کہ وہ اپنے اصلی مقصد سے ہٹ گئی ہے۔ اس کا اصلی مقصد صرف راج کا جی آزادی حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ اس کے آگے کی کئی منزلیں طے کرنی تھیں۔ اُن کی طرف بڑھنے کے بجائے آج وہ اُن سے اپنا منہ موڑ کر بالکل اُلٹی طرف کو دوڑی جا رہی ہے۔ باپو کے مشہد ہیں —

”ہندستان کو اب شہروں اور قصبوں کا خیال ہٹا کر سات لاکھ گاؤں کے لئے سماجی، سدا چاری اور مالی آزادی حاصل کرنی ہے۔“

باپو نے اوپر کے جملے میں ملک کی راج کا جی آزادی اور اس کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی آزادی میں فرق کیا ہے اور یہ اشارہ کیا ہے کہ اگر یہ دوسری آزادیاں حاصل نہیں ہوتیں تو صرف راج کا جی آزادی بالکل بے سود اور بے کار ہے، کیوں کہ یہ تو صرف ان دوسری آزادیوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حب الوطنی

مرکاہ چلی گئی تو پھر ہماری ان دوسری آزاد یوں کو کون چھین رہا ہے۔ ہم کس کا مقابلہ کر کے اس کو محفوظ یا شور کشت کر سکتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ انگریز گئے لیکن انگریزیت باقی ہے، یورپ گیا لیکن یورپی سبھیتا باقی ہے۔ اور جیسا ہم کہہ چکے ہیں، باپو بھی سبھیتا کو کبھی راج سے زیادہ زہریلی اور خطرناک سمجھتے تھے۔ پر جب خود دیش کی پارلیمنٹی حکومت اس سبھیتا کو پھیلانے کا ذریعہ بن گئی تب اس سے بچنے کا اس کے سامنے کون سا ذریعہ باقی رہ گیا۔ باپو گوری اور کالی حکومت میں فرق نہیں کہتے تھے۔ ان کا اس بارے میں ایک ہی معیار یا انپ ڈنڈ تھا کہ یہ حکومت جتنا کی سیوک ہے یا نہیں، اس میں دیا دھرم ہے یا نہیں، اس کی بنیاد عکرائی اور ہنسنا پر ہے یا ستیہ اور اہنسنا پر۔ موجودہ حکومت اس میں ایک معیار پر بھی پوری نہیں اُترتی۔ پھر اس کے خطرہوں سے دیش کیسے بچ سکتا ہے۔ جب کانگریس دیش کی سیوک تھی، تب یہ فرض وہ خود ادا کرتی تھی، اب جب وہ مالک ہے تو یہ سید ا کون کرے۔ باپو اُسے اپنے پرانے زمانے کی یاد دلاتے اور کہتے ہیں کہ جو جگہ اس نے خالی کی ہے، وہ جب تک بھر نہ جائے دیش میں سکھ، شانتی ترقی اور خوشحالی کا دور پیدا نہیں ہو سکتا۔

یہ خیال یا آشا کی حکومت خود اپنے آپ کو اور دیش کو کامیابی کے ساتھ سدھار سکے گی، بالکل غلط ہے، پارلیمنٹی راج اگر اپنے آپ کو سدھار سکتا ہوتا تو یورپ کا وہ حال نہ ہوتا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں، اگر اس پارلیمنٹی راج میں کچھ سدھار

ہوتے بھی ہیں تو وہ ہنسنا تک انقلاب کے ذریعے ہوتے ہیں۔ جو
انسانی دنیا کے لئے اس کے خطروں کو اور بھی بڑھا دیتے ہیں۔
اس لئے ایسی حکومت میں اصلی سدھار کرنے کے لئے کسی ایسی
ہی سسٹم کی ضرورت ہے جیسی کانگریس پہلے تھی۔ جب یہ صورت
حال ہے تب دیش کی بھلائی کے لئے دو باتوں میں سے ایک کا ہونا
لازمی ہے۔ یا تو کانگریس حکومت سے باہر اپنے پرانے فرض ادا کرنے
کا کام اپنے ہاتھ میں لے یا کوئی دوسرا سنگٹھن قائم ہو جو اہنساکو اپنا کریڈٹ
(دھیمیہ) بنا کر کانگریس اور اُس کی سرکار کو اُن کی آج کل کی کچھی سباجی،
سدا چاری مالی غلامی سے بچا سکے۔

پارلیمنٹری راج اپنے آپ کو ان دوشوں سے پاک نہیں کر سکتا، جو
اُس کے جنم کے دن سے ہی اُس کی فطرت (پرکرتی) اور خمیر میں شامل
ہیں۔ سچا دلکش سدھار اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کے
سارے کچھی طریقے نہ بدل دئے جائیں۔ کچھم کے اُن دُرا چاری طریقوں
کو بدلے بنا اس دیش کے سات لاکھ بد نصیب گھاؤں شہری اور کچھی سمیٹنا
کے ذمہ کاری اثر سے نہ بچ سکیں گے۔ کچھی سمیٹنا گھاؤں کو شہر بنانا
چاہتی ہے۔ وہ گھاؤں کی ساری دولت اور سادھنوں کو سمیٹ کر
ہندستان کے کارخانوں اور ان کے کرڈر پتی مالکوں کی مدد کرنا چاہتی
ہے۔ لیکن جب تک کچھی حکومتیں چھوٹی مشینیں بنانے والی بڑی
مشینیں اتنے بڑے پیلانے پر نہ دیں، یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا
اور کچھی حکومتیں اس طرح خود اپنی آتم ہتیا کرنے پر راضی نہیں ہو سکتیں
اسی لئے اُسے اپنی اس وناش کاری کوشش میں 'مایا' اور 'درام'

دونوں کو کھونا پڑے گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ہندوستان کی پارلیمینٹی حکومت کے پاس فوجیں اور ایٹم بموں کی طاقت ہوتی تو یہ دوسرے دیشوں سے اپنی ضرورت کی چیزیں زبردستی لے سکتی یا انہیں اپنی چیزیں دے سکتی تھی۔ لیکن بد نصیبی سے ہتھیاروں کے معاملے میں یہ مشینوں سے بھی زیادہ بچھم کی محتاج ہے اور یہ سمجھنا کہ بچھم لے اپنے مقابلہ کیلئے ہتھیار بند کر دے گا، ایک پاگل پن کی بات ہوگی۔

بچھم کی ہمنانگ اور وناش کاری پالیسی اور طریقوں کو چھوڑ دینے سے زیادہ ایک اور اہم پہلو اپنے کام کرنے کے موجودہ طریقوں کو چھوڑ دینے کے لئے اپونے کانگریس کے سامنے رکھا ہے۔ ان کے مشہد یہ ہیں۔

”ہندوستان جیسے جیسے اپنے اس جن راج کے کش کی

طرف بڑھے گا ویسے ویسے مول یعنی شہری طاقت فوجی طاقت کے اوپر قابو پانے کیلئے ضرور پوری پوری ٹکڑے گی۔ راج کا جی پارٹیاں اور فرقے دارانہ سنسکھاؤں کی لاگ ڈاٹ ہندوستان کو تندرست نہیں رہنے دے سکتی۔ ان سے دیش کو بچا کر رکھنا ہی ہوگا۔“

بچھی سمجھنا یورپ کی طرح ہمیشہ کے لئے اس دیش کو بھی ایک نہ ختم ہونے والی کشش ابے چینی اور برہادی کے دائرے میں گھیرے رکھے گی اور اس میں اور باہری طاقتوں میں ایک ان سٹ ٹکڑے قائم رکھے گی۔ لیکن اس سے زیادہ وناش کاری پسلو یہ ہے کہ پارلیمینٹی حکومت کے دو پارٹی سسٹم کا قدتی نتیجہ یہ ہے

کہ خود ملک کے اندر یہ طریقہ ہنسنا تک راج کا جی انقلابوں کے
 بیچ برابر رہتا رہتا ہے۔ کسے دن راج کا جی طوفان اُٹھتے ہیں اور
 حکومتوں کو طاقت کے زور سے بدلنے کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔
 ان کوششوں میں دیش کا ہر گروہ اور ہر طبقہ حصہ لیتا رہتا ہے اور
 اس طرح باری باری سے کبھی یہ کبھی وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں
 سے زخمی اور برباد ہوتے رہتے ہیں۔ یورپ کا آخری چار سال کا تجربہ
 اس بات کا ثبوت ہے اور اس کے ہر دیش کے گھریلو بھگدوں کی
 ایک سی کہانی اور اس کی ٹھنڈی اور گرم لڑائیوں کی کہانیوں سے اہم
 کے پتے رنگے ہوئے ہیں۔

پارلیمنٹری حکومت کی یہ خاصیت یورپ سے کہیں زیادہ اس دیش
 کے لئے خطرناک اور ناش کاری ثابت ہوگی۔ راج کا جی پارٹیوں
 کے ساتھ ساتھ یہاں فرقہ دارانہ جذبات اور دل بندیاں بڑے سے
 بڑے پیمانے پر موجود ہیں اور پڑائی سختیوں کے علاوہ اس قسم
 کی نئی نئی خطرناک پارٹیاں روزانہ جنم لے رہی ہیں۔ راشٹریہ سویم سیوک
 سنگھ ابھی نہیں ایک دور کی بے رنگ دھندھلی تصویر کی طرح نظر
 آ رہا ہے، مگر آج بھی ہمارا شہر میں برہمن، ابراہمن یا آدی داسی تحریکوں
 کے کارن سیکڑوں، برہمن گاؤں چھوڑ کر شہروں میں آکر رہنے پر مجبور ہو رہے
 ہیں۔ اور جہاں تک ہمارا خیالی ہے شہریت سنگھ کے آندھلی نے
 یو۔ پی میں آخری پنجائتوں کے چناؤں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سنگھ
 چناؤ تک ہی یہ خطرناک تحریک ایک انقلابی روپ لے لے گی۔ ادھر تو
 یہ جذباتی طوفان پیدا ہو رہے ہیں، ادھر سے کیونسٹ آندھلی کی انقلابی

گھٹائیں ان طوفانوں کو ساری دنیا میں پھیلا دینے کی بھیانک کوازیں
 سنا رہی ہیں اور اس میں سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہم جو
 صدیوں سے نہتے اور بے ہتھیار تھے آج اپنی اس بھوک اور
 ہوس کو مٹانا اپنا پہلا قومی فرض سمجھ رہے ہیں اور جیسے کوئی اپنی
 چٹا کے لئے آپ نکلے یاں جٹاتا ہو، ہم آنکھیں بند کر کے چاروں
 طرف ہتھیار جمع کرنے اور بانٹنے اور فوجی اور ادھ فوجی گھیرے بنا کر
 اپنی موت کا خود انتظام کر رہے ہیں۔ باپو نے ان بھیانک حالتوں سے
 کانگریس کو آگاہ کیا ہے کہ آج کی حالتوں میں ملک کی سول اور فوجی
 طاقتوں کا آپس میں ٹکریں لینا منور ہے اور سیاسی دفرے دارانہ
 پارٹی بازیوں میں وہ غوغا مچا رہی اور بربادی پیدا کریں گی
 جس سے دیش کے جیون کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ اس لئے کانگریس
 کو اس نامشکاری ماحول (داتا دن) سے باہر آکر اس کے بچاؤ کا
 سامنا کرنا چاہئے۔

باپو کا کہنا ہے کہ جیسے جیسے ہندستان اپنے اس جن رات کی
 منزل کی طرف بڑھے گا ویسے ویسے اس کی سول طاقتیں لازمی طور پر اس
 کی فوجی طاقتوں پر قابو پانے کے لئے ان سے ٹکرائیں گی۔ کانگریس کے لئے
 اچھا یہ ہے کہ وہ راج کا جی پارٹی بندیوں اور فرتے دارانہ دل بندیوں کی
 گندی کھینچا تانی سے بالکل الگ رہے۔

ان سارے طوفانوں سے بچنے کے لئے، جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے
 اور ان سے دیش کو بچانے کے لئے باپو نے کانگریس کو لوک سبک سنگھ
 بن جانے کی صلاح دی ہے، ان کے مشہد یہ ہیں۔

”ان کارنوں سے اور اسی کے طرح دوسرے کارنوں سے
آل انڈیا کانگریس کمیٹی موجودہ کانگریس سنگٹھن کو توڑ دینے اور
نیچے لکھے قاعدے کے انوسار لوک سیوک سنگھ کا سند روپ
لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔“

اس میں شک نہیں کہ اس سے زیادہ انقلابی صلاح کانگریس کے
لئے دوسری نہیں ہو سکتی تھی۔ کانگریس جیسے مہان اور شاندار سنگٹھن کو
یہ صلاح دینا کہ وہ خود اپنے باحقوں سے اپنا گلا گھونٹ دے، باپو
کا ہی کام تھا۔ باپو کو خود اس پر مشکل سے ہی یقین رہا ہو گا کہ وہ ان
کی اس صلاح پر عمل بھی کرے گی۔ لیکن اگر ہم باپو کے جیون پر گہری
نگاہ ڈالیں، اور کانگریس سے ان کا جو سمبندھ تھا، اُسے سامنے رکھیں تو
ہمیں ماننا پڑے گا کہ کانگریس ماننی یا نہ ماننی، باپو اس کو کوئی دوسری
صلاح نہیں دے سکتے تھے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ باپو کے راج کا جی جیون کے شروع سے ان کی
موت کے دن تک ان کے اور کانگریس کے دھاروں اور طریقوں میں ہمیشہ
زمین آسمان کا فرق رہا ہے۔ یہی کارن تھا کہ وہ اُن کی صلاحوں اور طریقوں
سے پورا قائل نہ اٹھا سکی۔ یہ فرق بہت گہرا، اصولی اور سچا تھا۔ اس کو
سمجھنے کے لئے باپو کے کام کرنے کے طریقوں پر گہری نظر ڈالنی چاہئے۔

قومی جیون کے نازک سے نازک موقعوں پر باپو نے بار بار کانگریس
اور دیش کو یہ صلاح دی ہے کہ وہ راج سے کوئی سمبندھ نہ رکھے اور
سرکاری دائروں سے بالکل الگ رہے، وہ کونسلوں اور اسمبلیوں میں بالکل

نہ جائے ، وہ چناؤ میں حصہ نہ لے ، وغیرہ وغیرہ کا گریں نے کبھی ان صلاحوں کو مانا کبھی نہ مانا پر باپو اپنے اس خیال کو چھینہ اس کے سامنے رکھتے رہے۔ اس کے پیچھے باپو کا ایک بنیادی اصول تھا جسے انگریزی حکومت کے سنے ایک حد تک کانگریس نے منظور کر لیا تھا۔ وہ یہ کہ سرکار سے الگ رہنا ، سرکار کا مقابلہ کرنے کے لئے جتنا کی طاقت کو بڑھانا جو اور جو جماعت حکومت کو قابو میں کر کے اسے بدلنا ، سدھانا اور میسر راستے پر لانا چاہتی ہے۔ وہ جب تک آپ حکومت کے داروں سے دور اور باہر نہ رہے گی وہ کبھی جتنا کی بچی لگائی نہ کر سکے گی اور نہ اس میں ہمت کے ساتھ سرکار کا مقابلہ کرنے کی شکیں پیدا کر سکے گی۔

کانگریس باپو کی اس بنیادی ہدایت کو کہ پارلیمنٹری حکومت کا سدھا اس کے اندر رہ کر نہیں ہو سکتا اس کا سدھار اس کے باہر رہ کر ہی ہو سکتا ہے ، نہیں سمجھ سکی۔ باپو دراصل کانگریس کو انگریزی سرکار کو نکالنے کا مادھن نہیں بنانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے طور پر اس کے لئے اس سے بہت اونچی جگہ چن چکے تھے اور اُنھیں آشنا تھی کہ انگریزی سرکار سے جیتنے کے وقت تک کانگریس میں اتنی تینک بلندی اور دور اندیشی پیدا ہو جائے گی کہ وہ اُن کے اصلی مقصد کو سمجھ سکے اور اُس پر عمل کر سکے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ کانگریس جنتا کی رکشا اور ترقی کا اور دلش کی سرکار کو جنتا کا سچا سپورک اور جنتا کو دلش کا راجہ اور مالک بنائے رکھنے کا ایک شکاؤ سداہن اور طاقت بن جاوے ، باپو کے لئے سچے سوراج کا یہی پہلا قدم تھا۔

کانگریس دھماکی اکیلی اور مہان سنسٹھا تھی جس نے تھوڑی بہت باپو کی رہنمائی میں نینک پودگرم اپنا کر دنیا کے سب سے بڑے سامراج کا بنا فوج اور ہتھیاروں کے مقابلہ کیا تھا۔ اس نے بیٹال تیاگ اور بے غرض سبھا سے لے کر دیش بھائیوہ کے دل پر قابو پالیا تھا۔ باپو اس مہان سنسٹھا میں اس کے پلانے بھال پھر سے جگانا چاہتے تھے۔ سبھا سنگھ بن جانے کی صلاح دینے سے ان کا یہ مطلب نہ تھا کہ اُس کی سرکار کے منتری اور نیتا گاؤں میں بیٹھ کر چرچہ کاٹنے کو اپنا کام بنالیں۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ اُس کے سرکار سے جٹ جانے کے بعد اس کی جگہ کوئی تانا شاہی یا فرقے دارانہ سرکار قائم ہو جائے، بلکہ وہ کانگریس کو راج گدی سے ہٹا کر دیش رکشا اور دیش مدھار کے کام اس کے سپرد کر کے تانا شاہی یا دیش دروہی سرکار کے قائم ہونے کی سمجھاؤنا کو ہی سدا کے لئے مٹا دینا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کانگریس اگر راج کالج کو رنج کر دیش سبھا کے میدان میں پھر سے آجائے تو دیش کی کوئی بھی پارٹی اکیلی یا مل کر سرکار کا کام کانگریس کی مرضی کے خلاف کچھ دنوں کے لئے بھی نہیں چلا سکتی۔ اس کے باہر آجانے سے اس کا تیاگ دیش میں ایک اخلاقی یا نیکی بل چل مچا دیتا، وہ پھر ایک بار جاگ اٹھتا۔ کانگریس کی غیر معمولی سنگٹھن شکست تھوڑے ہی عرصہ میں غتا کے جذوبں وچاروں اور سنگٹھنوں میں ایسا زبردست انقلاب پیدا کرتی کہ دنیا کی کوئی بھی حکومت اچانک وہ کہتی ہی خود غرض، دنیا پرست اور دیش کی دشمن کیوں نہ ہوتی، کانگریس کے اثر اور قابو کے باہر دیر تک نہیں رہ

سکتی تھی، اس کے لئے اس کے سیوگ اور مدد کے بنا سرکار چلانا بالکل ناممکن ہو جاتا۔ دراصل یہاں اس طرح دلش میں ایک ایسی اخلاقی یا سلاچار حکومت قائم ہو جاتی جو یہاں کی راج کاہی حکومت سے اونچی ہوتی اور ہمیشہ اس کے سدھار اور رہنمائی کا فرض ادا کر سکتی۔ اس لئے جو صورت پنڈت جواہر لال نہرو کو ایسی ڈراؤنی نظر آتی تھی وہی باپو کی رائے میں دلش کو اس کے سارے موجودہ خطروں اور جھگڑوں سے ہمیشہ کے لئے بچا لینے کا اکیلا ذریعہ تھی۔

باپو کانگریس کو تخت سے اتارنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اس کو دلش کا سپتا ناکندہ اور اصلی راجہ بنانا چاہتے تھے۔ اور اس طرح اُن ہمنام تک راج کاہی انقلابوں کا سدا کے لئے خاتمہ کر دینا چاہتے تھے جنہیں پارلیمینٹی حکومت قدرتی طور پر پیدا کرتی ہے۔ اور اس طرح وہ اس حکومت کا بچھی جاسم اتار کر اُسے اپنے دلش کی پوشاک پہنا دینا چاہتے تھے۔ لیکن آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رہنما اُن کے ان جذبات اور وچاروں کو سمجھنے سے لاپچار تھے کیونکہ پچھلی سبھیٹا ان میں سے بہت سوں پر اپنا گہرا رنگ جمائے ہوئے تھی اور پچھلی پنڈتوں نے انہیں یہ تعلیم دی ہے کہ راج کاہی انقلاب قدرت اور انسانی فطرت یا مانو پر کرتی کے لازمی کرشمے ہیں۔ اور باپو کے ستیہ اور اہمسا کا سبق قدرت کے قانون اور انسانی سو بھاؤ دونوں کے خلاف ہے۔ انہیں وچاروں کے کارن آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے باپو کی آخری وصیت — ان کے لوک سیوک سنگھ کے ودھان — کو جب وہ پرستادہ کے رُوپ میں اس کے سلسلے پیش ہوا تو نا منظور کر دیا۔

ستیگرہ اور رچنا تک پروگرام

دھان کی پرستانڈا کے بعد باپ نے اپنے نوک سیوک سنگھ کا سنگھن بتایا ہے۔ سودے سے پتہ چلتا ہے کہ باپ اس دھان کی مدد سے راج کا جی وارے سے باہر ایک ایسا گردہ پیدا کر دینا چاہتے تھے جو جنتا کا سپا سیوک ہو اور جنتا کا اس طرح اور اس پیلانے پر سنگھن کر دے کہ جنتا ہر در دھنی طاقت سے، چاہے وہ دلشی ہو یا دوشی، اپنا بچاؤ کر سکے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس دھان کی دغاؤں کو ایک ایک کر کے بیکان کریں، ہم کچھ ایسی باتیں کہنا چاہتے ہیں جن سے اسکے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں آسانی ہوگی۔

اس دھان کو سمجھنے کی کوشش میں ہیں اس بات کا خاص دھیان رکھنا چاہئے کہ یہ دھان باپ کی ۵۰ سال کی زندگی کی آخری کڑی ہے۔ یہ ان کے اس مقصد کو حاصل کرنے کا آخری پروگرام ہے جس کی طرف بڑھنے کی وہ ۵۰ سال سے کوشش کر رہے تھے اور جس کی بہت سی منزلیں وہ طے کر چکے تھے۔ اس لئے اگر ہم اس پروگرام کو باپ کے آدرشوں، اصولوں اور آندولنوں سے الگ کر کے دیکھنا چاہیں تو ہم اس کے اصلی مطلب کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس کے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم باپ کے جیون کی پوری لغتویر اپنے سامنے رکھیں۔

ہم نے اوپر باپ کے جیون کے کئی مقصدوں کی چرچا کی ہے پر سچ سچ یہ

کون کہہ سکتا ہے کہ باپ کی زندگی کا اصلی مقصد کیا تھا۔ کوئی کہے گا کہ ایشور کو سাকشات کرنا یعنی اس کا دیدار حاصل کرنا تھا۔ کوئی کہے گا کہ آتم دشن یا "سلف ری لائزیشن" تھا۔ کوئی کہے گا کہ انسان کی خدمت کرنا تھا۔ کوئی کہے گا کہ کھانا کھانا کرنا تھا۔ کوئی کہے گا کہ کچھ سبھی سمجھتا ہے ناشک اور شیطانی چلوؤں سے ہندستان کو اور اس کے ذریعے سے انسانی دنیا کو بچانا تھا۔ سچ یہ ہے کہ یہ سارے مقصد ان کے سامنے تھے۔ اور یہ سب ایک ہی سچائی کے الگ الگ پہلو ہیں، ان میں کوئی ایک دوسرے کے خلاف نہیں۔ ایک ہی آدمی ان سب مقصدوں کو حاصل کرنے کی ایک ساتھ کوشش کر سکتا ہے۔

پر جہاں تک ہمارا سوال ہے ہم اس ودھان میں باپ کو دنیا سے ایک سیوک کی طرح دیکھیں گے، اور اس میں بھی ان کی زندگی کے اس حقے کو سامنے رکھیں گے جو خاص طور سے راج کاج سے سمبندھ رکھتا ہے۔ باپ کا یہ ودھان اس سارے سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ یہ سلسلہ دکن افریقہ سے شروع ہو چکا ہے۔ وہیں باپ کے سامنے وہ صورتیں آئیں اور وہ ان نیتوں پر پہنچے جن سے ان کے آگے کی زندگی کا سارا پروگرام طے ہو گیا۔ ہم سے نیتوں میں سے کچھ، جو ہماری اس سے کی جڑ سے سمبندھ رکھتے ہیں، نیچے دیتے ہیں —

۱۔ کچھ سمجھتا ایک شیطانی سمجھتا ہے۔

۲۔ پارمینٹی راج کج کل کا ڈھانچہ اور رنگ ڈھنگ انسانی دنیا کو مٹا دینے والا ہے۔

۳۔ اس سمجھتا اور اس طرح کے راج میں ایک اخلاقی انقلاب

ستیگرہ اور رچنا تک پروگرام

یعنی نیتک کرانتی ہونا انسان کی بھلائی کے لئے ضروری ہے۔

۴۔ یہ انقلاب تلوار سے یا کسی بھی ہنسنا کے طریقے سے پیدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کی انقلابی کوششیں انسان کی تباہی اور بربادی کو اور بھی بڑھا دیں گی۔

۵۔ کسی شیطانی طاقت کو اُس سے بڑی شیطانی یا حیوانی طاقت کھڑی کر کے اُس کے ذریعہ سے مٹانا غلط ہے، کیونکہ اس سے شیطانیات بڑھے گی، کم نہیں ہو سکتی۔

۶۔ حیوانیت کا مقابلہ صرف انسانیت سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مانو پریم کی شکتی تلوار کی شکتی سے زیادہ بلوان اور زیادہ اثر والی ہے۔

۷۔ اگر مانو پریم کو ستیاگرہ کا روپ دیا جاوے اور ستیاگرہ سے ایک بڑے پیمانے پر سدا چار کی شکتی پیدا کر دی جائے تو دنیا کی کوئی ہنسنا کی شکتی اس کے سامنے کھڑی نہیں رہ سکتی۔

۸۔ دنیا میں اخلاقی یا نیتک انقلاب دو ہی طریقوں سے پیدا ہو سکتا ہے۔

ایک تو خود حکومت کا دل بدل جانے سے دوسرے جتنا میں اتنی جاگرتی، شکتی اور سنگٹھن پیدا ہو جانے سے کہ وہ حکومت کی سچی مالک بن سکے اور حکومت کو ایک سچا سیوک بنے رہنے پر مجبور کر سکے۔

۹۔ اوپر کی دونوں باتیں ستیاگرہ اور رچنا تک پروگرام کی

مدد سے پوری ہو سکتی ہیں۔ ہندستان کی ہوا اس پروگرام کے لئے بڑی مددگار ہے۔ اگر ہندستان میں ایک گروہ ستیاگرہ کی سہولتوں میں ستیاگرہیوں کا تیار ہو جاوے تو ان دونوں باتوں میں ایک نہ ایک اچھی طرح پوری ہو سکتی ہے۔

ان بنیادی دھاروں کو باپو دھن افریقہ سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ ستیاگرہی تیار کرنے کی بنیاد دھن افریقہ میں فینکس آشرم کی شکل میں پڑ چکی تھی۔ ہندستان میں آتے ہی باپو نے ستیاگرہ آشرم کھولا اور بھارت کو ستیاگرہ کی مدد سے آزاد کرانے کے لئے جو دوسری تیاریاں ضروری تھیں، شروع کر دیں۔ پر جب باپو رولٹ ایکٹ والے آندولن کے سلسلے میں پہلی بار راج کا جی میدان میں اترے تو ایک نئی کٹھنالی اُنکے سامنے آئی جسے انھوں نے دھن افریقہ میں محسوس نہ کیا تھا۔

رولٹ ایکٹ والے آندولن کے شروع ہوتے ہی پنجاب اور کئی دوسری جگہوں پر بلوے ہو گئے۔ لوگوں نے سسرکار کی ہنساکا ہنساکا سے جواب دیا۔ اسی پر باپو نے اپنے آندولن کو روک دیا۔ اس سببندھ میں انھوں نے ممبئی میں اپنے دُکھ اور اپنی کٹھنالیوں کو ان شدیدوں میں ظاہر کیا۔ ”مجھ سے ایک ہمالہ پہاڑ کے برابر غلطی ہو گئی ہے؟“ باپو نے اپنی غلطی یہ بتلائی کہ میں نے ایک نیک ہتھیار کے بنا اُسے کام میں لانے کی تعلیم دیئے ملک کے ہاتھوں میں دے دیا۔

اگرچہ اس بنیادی بات کو دھیان میں رکھیں، تو ہمیں ستیاگرہ اور رچنا تمک پروگرام میں کیا سببندھ ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ

ستیگرہ اور رچنا تک پروگرام

میں آسکتا ہے۔ باپو کہتے ہیں کہ ستیگرہ نیک اور روحانی ہتھیار ہے، اس لئے جتنا یہ ہنسا سکے ملاؤ سے پاک اور صاف رکھا جائے، اتنی ہی اُس کی طاقت بڑھتی ہے اور اُسی پیمانے پر یہ بھلائی کا سوتا بن جاتا ہے۔ ہنسا کا ملاؤ اس کی اخلاقی اور تعمیری طاقت کو نشوونما کے اُس میں اُٹنے ناس اور ہمدردی کے بیج پیدا کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ باپو کے تعمیری پروگرام کا مطلب یہ تھا کہ وہ ملک کو جگہ کر اُس میں ایسا سداچار اور ایسا سنگٹھن پیدا کر دے کہ جس سے اس کے رہنے والوں میں ستیگرہ کا ہتھیار کام میں لانے کی طاقت پیدا ہو سکے۔ باپو کی اس بات کو ملک اور کانگریس نہ سمجھ سکے۔ باپو کو اسی بات پر خلافت اور سوراج کے زوردار آندھنوں کے سب بڑے بڑے کانگریسی لیڈروں کی اچھا کے خلافت احمد آباد میں دوبارہ رکنا پڑا۔ چوری چور کی ہنسا کے علاج کی صورت میں باپو نے وہ تعمیری پروگرام ملک کے سامنے رکھا جو بارہ دہائی پروگرام کے نام سے مشہور ہوا اور آجستہ مرتے دم تک باپو اپنا بنیادی اور اصولی تعمیری پروگرام کہتے تھے۔

اُن کے اس پروگرام کو اگر ہم دھیان سے دیکھیں تو ہمیں اُن کے اس آخری بدھیان کو سمجھنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ یہ پروگرام ہماری سوئی ہوئی سداچار کی طاقتوں کو پھر سے جگانے کے لئے دیا ہی تھا جیسا نقوے کے مارے ہوئے ہاتھ پیروں کے لئے دنا کی مالش۔ یہ ملک میں آتم بل پیدا کرنے کا ایک زبردست اور سب سے اچھا طریقہ تھا۔ باپو نے اس میں وہی ڈھنگ برتا

ہے جو کسی ایک آدمی کے سداچار کو ٹھیک اور ادنیٰ کرنے کے لئے برتا جاتا ہے۔ یعنی اپنی کچھ نیتک کمزوریوں کو جو سب سے زیادہ دکھائی دینے والی اور بنیادی ہوں انہیں سامنے رکھ کر اُن کو دور کرنے پر اپنی ساری شکست لگا دینا۔ اپنے بار دہلی پر دگر ام کو بنانے میں باپو نے دلش کی زندگی کے ایک ایک پہلو سے ایک ایک چیز جن لی ہے۔ آرتھک سے چرخہ، مذہبی سے ہرنجن، اُدھار، اسٹری سے ہندو، مسلم، ایکتا، اخلاقی سے شراب بندی اور دماغی سدھار کے لئے تعلیم جس طرح دھرم کے چار چرن کہے جاتے ہیں اسی طرح یہ پانچ باتیں قومی زندگی کے پانچ تعمیر پہلو ہیں۔

باپو کا خیال تھا کہ اگر ملک اُن میں سے ایک پر بھی اپنی ساری سکتی لگا کر اُسے پورا کر لے گا تو اُس میں اتنی جاگرتی سٹھن اور آتھس پیدا ہو جائے گا کہ پھر اُس کے ستیہ گرہ یعنی اچھا شکست کا کوئی حکومت مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ پر جیسا ہم نے کہا کانگریس باپو کی تحریکوں کے اس پہلو کو نہ سمجھ سکی۔ نہ تو اُس کو باپو کے ستیہ اور اہنسا میں دشواش تھا۔ اور نہ وہ کسی نیتک جیون کی ضرورت محسوس کرتی تھی۔ اس لئے اُس نے باپو کے ستیاگرہ کے کیوں راج کا جی پہلوؤں سے مدد لی اور اُس کے اخلاقی پہلوؤں کو بے دردی سے مالتی رہی۔ کانگریس کی آج کل کی شری ہوئی نیتک حالت اسی غلطی کا نتیجہ ہے جسے دنیا دیکھ کر حیران ہے اسی کا یہ بھی نتیجہ ہے کہ ملک کے ددھکرے ہو گئے اور ہم نے باپو کو بھی ہاتھ سے کھو دیا۔

یہ خطرے شروع سے ہی باپ کے سامنے تھے۔ کانگریس اور ملک کو اپنے
 رچنا تک پر دگرام کی طرف سے بے پردہ دیکھ کر اُن کے دل کو دکھ ہوتا
 تھا۔ ایک بار انھوں نے اپنے اس دکھ کو ان شبہوں میں ظاہر کیا تھا۔
 "میں ہزاروں بار دہرا رہا ہوں کہ اگر ہم رچنا تک پر دگرام کو ایک اچھے
 بیٹا نے پر پورا نہ کر سکیں گے تو ہمیں سواج نہیں مل سکتا۔ اگر مل بھی
 جائے تو ہم اسے رکھ نہیں سکیں گے۔ اگر رکھ بھی سکیں گے تو اُس کا وہ پڑ
 نہ ہو گا جس کا ہم سینا دیکھ رہے ہیں۔"

باپ کی اس تڑپ کا کوئی اثر ملک پر نہ پڑا۔ مشکل یہ تھی کہ ستیہ اور
 اہنسا کا جو روپ اور اس سے جو آثاں وہ ملک کے سامنے رکھ
 رہے تھے۔ اُن پر ملک کو کسی طرح بھروسہ نہ ہوتا تھا کبھی سبھیتا
 دیش کے سب لوگوں پر گہرا اثر ڈالے ہوئے تھی۔ یہ اثر لوگوں
 کی طبیعتوں کو اخلاقی اور روحانی باتوں کی طرف جانے ہی نہ دیتا
 تھا۔ ادھر باپ کے لئے ستیہ اور اہنسا کی شکتی ایسی صاف تھی کہ
 جیسے ہمارے پاؤں کی شکتی۔ وہ اس کے ہر پہلو اور اس کی پوری
 طاقت کو جانتے تھے۔ یہی کارن تھا کہ وہ بے چین تھے کہ مانو جاتی
 اس سے جلدی سے جلدی پورا فائدہ اٹھا سکے۔ اسی لئے باپ ستیہ
 گرہ اور تعمیری پردگرام دونوں پر ایک سادھیان اور ایک سازدہ
 دیتے تھے۔ اور انھوں نے کانگریس یا ملک کی لاپرواہی کی ذرا بھی
 پردہ نہ کی۔ ہم دکھا چکے ہیں کہ کانگریس باپ سے کیسے برابر دور
 ہی ہوتی گئی۔ اسی کے ساتھ باپ کی ساری رچنا تک کو ششیں
 نذر رہتی گئیں کیونکہ یہ کوششیں بھی انگریزی راج سے لڑائی

کے دنوں میں کانگریس کے ہی کام پر شروع کی گئی تھیں۔ باپ کی
 اٹھائی یہ تھی کہ وہ نہ تو کانگریس کو پوری پوری مدد دینے سے مرعوب
 کتے تھے کیونکہ اس سے کانگریس انگریزی راج کے مقابلے میں کمزور
 پڑ جاتی، نہ اس کے سدھار کے لئے کوئی سخت قدم اٹھا سکتے تھے
 کیونکہ اس میں دورخی لڑائی شروع ہو جاتی اور ملک کی طاقت اور
 دھیان دونوں بٹ جاتے۔ رچنا تمک کاموں کو پوری طاقت کے
 ساتھ چلانے کے لئے اُن میں ستیاگرہ کے پہلو کا ہونا ضروری تھا۔
 کیونکہ باپ کے یہ دونوں پردگراں ایک جان اور دو قالب اور ایک
 ہی ڈھال کے دو پہلو تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باپ کے سارے رچنا تمک
 پردگراں آہستہ آہستہ مرجھانے اور بے جان ہونے لگے۔

رچنا تمک کام کرنے والے بھی اس اثر سے نہ بچ سکے۔ یہ لوگ
 باپ کی تحریکوں کے جانکاروں کی صورت میں چاروں طرف پھیلے
 ہوئے تھے۔ باپ عام طور سے ان کو راج کالج کی برائیوں اور گھنپا
 تانی سے الگ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ پر سسے سسے پر انھیں
 اپنی زرد سپنا کی طرح راج کا جی ستیاگرہ میں لے گیا کرتے تھے۔
 اس لئے انھیں ایک تو ستیاگرہ سے کوئی سیدھا سنبدھ نہ رہتا تھا
 دوسرے اگر یہ کانگریس کے ساتھ ستیاگرہ میں حصہ لیتے تھے تو
 ان کے اور کانگریس والوں کے طریقوں میں بہت کم فرق ہوتا تھا۔
 تیسرے جو باتیں ان کا سب سے زیادہ دل توڑ دیتی تھیں وہ یہ تھیں
 کہ باپ کانگریس اور اس کے اُن نیناؤں کا جو رچنا تمک کام کو فضول
 اور بڑھوں کا کام سمجھتے تھے، ہمیشہ ساتھ دیئے رہتے تھے۔ ان کی

طاقت کو طرح طرح سے بڑھاتے رہتے تھے۔ اور جہاں کہیں رچاننگ کام کرنے والوں اور ان کا نگہبانی نیتاؤں میں کوئی ٹکڑا ہو جاتی تھی، باوجود کہ کئے کا نگہبانی نیتاؤں کی ہی طرف اشارہ کرتے تھے۔ انگریزی سرکار ان کے رچاننگ کام میں سیدھے بہت کم دخل دیتی تھی۔ اس لئے رچاننگ کام کے میدان میں وہ حالت ہی نہ پیدا ہوتی تھی جس میں سٹیگرہ کرنے کی ضرورت ہو، اور حکومت کے حملوں کے مقابلے میں ان میں کشمکش اور آئبل پیدا ہو۔

بے غرض سیوا سے آئبل پیدا ہوتا ہے پر اسی حالت میں جب سٹیگرہ اور تعمیر کا پر دگرام دونوں ہمارے سامنے ایک ساتھ ہوں۔ ایک سے ہم تعمیر یعنی رچاننگ کریں اور دوسرے سے اس اپنی تعمیر کو ان شکلیوں سے بچا کر رکھیں جو اسے بگاڑنا چاہتی ہیں اور نئی زمینیں صاف کریں اور راستوں کی رکاوٹوں کو ہٹاتے رہیں۔ یہ سب باتیں برابر جاری رہنا ضروری ہیں۔ آئبل اپنے آپ پیدا نہیں ہوتا، اسے پیدا کرنے کے لئے دل کی صفائی اور اپنے اوپر قابو دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں چرخے کا تنایا کوئی بات بھی کیوں رسم پوری کرنے کے لئے کرنا ایک بے جان رد و لج یا رد و صی کی صورت لے لیتا ہے، جب تک ان کے پیچھے کسی ادنیٰ مقصد کو پورا کرنے کا دھار نہ ہو۔ اگر ہم چرخے کی چھٹی سمجھتا پر وجہ پائے اور اپنے ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کو دل میں لے کر کاتتے ہیں اور اپنے آرٹھک جیون سے ہر ایسی رکاوٹ کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کوشش کی کامیابی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں تب ہم میں

آئبل اور سنگھن شکتی پیدا ہو گی۔ لیکن اگر ہم کیوں چرخہ سنگ کے ممبر کے فرض کی طرح یا باپ کی خوشی کے لئے یا لوگوں پر ثابت کرنے کے لئے کہ ہم گاندھی دادی ہیں، کاستے ہیں۔ تو اس سے آئبل پیدا ہونے کی جگہ ہماری اخلاقی طاقت اور بھی کمزور اور برباد ہو جاتی ہے۔ کیوں رچنا تک کام کرنے سے اس کام کو اچھے سے اچھے نتیجوں کے درد و دھویوں سے بچا کر رکھنے کی طاقت ہم میں پیدا نہیں ہو سکتی یہ طاقت تب پیدا ہوتی ہے جب رچنا تک کام کے ساتھ ساتھ ہم میں یہ خیال بھی بنا رہے کہ ہمیں اپنی جان دے کر بھی اسے بچا کر رکھنا ہے۔ یعنی رچنا تک کام کے ساتھ ساتھ ستیاگرہ کی شکتی اپنے اندر پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔

باہری درد و دھوی شکتی سے کامیابی کے ساتھ ٹھک لینے کی طاقت ہم میں بھی پیدا ہو سکتی ہے جب اس کو مٹانے کا خیال ہر سقمے ہمارے سامنے رہتا ہے۔ اور اس خیال کو ہم نیک نیتی کے ساتھ ہر وقت اپنی زندگی میں اصلی روپیہ دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اگر یہ پہلو ہماری رچنا تک سیوا میں نہیں ہے تو ہم اپنے آس پاس کوئی اچھا انقلاب پیدا نہیں کر سکتے۔ ہمارے رچنا تک آندولن یہ صورت نہ لے سکے۔ اگر یہ صورت پیدا ہو گئی ہوتی تو ہماری لاسٹر یہ زندگی کے ہر پہلو میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہو گیا ہوتا۔

کچھ سقمے سے اور خاص کر آخری دنوں میں باپو نے دردوں سے محسوس کر رہے تھے کہ ان کے سارے رچنا تک کام بے جان اور پھیکے ہو رہے ہیں۔ ان میں وہ نیک شکتی باقی نہیں رہی جو ان کی

ستیگرہ اور رچا تک پروگرام

اصلی جان اور روح ہیں۔ مثال کے طور پر کھادی کے آند دین کے انقلابی صورت لینے کے بجائے کیوں گھٹیا درجے کے بیوپار اور بیوپاری کی شکل لے لی تھی۔ لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کے بجائے کھادی سے اُنھیں اور بھی نفرت ہوتی جاتی تھی۔ کھادی کی ٹری بڑی سنتھادوں کو لوگ کھلے ہندو اسیٹ انڈیا کمپنی کہتے تھے۔ ہریجن سبوا کی تحریک ہریجنوں کو کچھ آسانیاں اور حق دلائے تک رہ گئی۔ اس نے ہندو سماج اور دھرم پر وہ اثر نہ ڈالا جس کی باپو کو امید تھی۔ باپو کہا کرتے تھے کہ اگر ہندو نے ہریجن آند دین کے اصلی مطلب کو سمجھ لیا اور اسے اپنی زندگی میں سچے دل سے جگہ دے دی تو ہندو سماج ایک نیا تہذیب لے لے گا۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک ہندو سماج کے ماتھے سے یہ کلنک کا ٹیکہ نہ مٹے گا تب تک ہندو سماج نفرت اور خود غرضی کا سوتا بنا رہے گا اور سچے ہندو مسلم اتحاد کی گہری بنیادیں کسی صورت میں قائم نہ ہو سکیں گی۔

ہندو مسلم اتحاد کے آند دین میں بھی باپو اپنے دل کا مطلب لوگوں کو نہ سمجھا سکے۔ اس میں اُن کا اتنا قصور نہ تھا۔ ملک اتنا ادنیٰ اُنھیں ہی نہیں سکنا تھا کہ ان کی صلاحوں اور ان کے آند دینوں سے پورا قاعدہ اُٹھا سکے۔ پچھم کے اثر نے اسے نکمٹا اور اندھا کر دیا تھا۔

باپو شانت سینا کے سنگٹھن کو ہندو مسلم دونوں کے ختم کر دینے کا اصلی اور آخری علاج مانتے تھے۔ پر اس پر دیگر اُم

کو علی روپ دینے کے لئے وہ اپنے پیارے سے پیارے شاگردوں کو بھی راضی نہ کر سکے۔ مدتوں پہلے اُنہوں نے شانتی سینا کے خیال کو ”گاندھی سیوا سنگھ“ کے سالانہ جلسے (گرام گڑھ) میں رکھا تھا۔ پر گاندھی سیوا سنگھ کے ممبروں نے اسے علی بات نہ سمجھ کر اُس پر کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اوروں کے ساتھ ساتھ اس بات نے بھی سیوا سنگھ کے قریب قریب توڑ دیئے جانے میں بڑا حصہ لیا ہو۔ آخری دنوں میں جب ہندو مسلم دنگ اتنی بری صورتیں لے رہے تھے۔ باپو نے شانتی سینا کا چہ چہرے شروع کیا تھا۔ اس زمانے میں اُن کے ایک چیلے نے اُنہیں لکھا کہ ”باپو! ہندو مسلم دنگوں میں ہتھے گھس کر جان دینے کی صلاح آپ ہمیں مدتوں سے دے رہے ہیں۔ پر آج تک آپ نے یہ ہمیں خود کر کے نہیں دکھایا۔ گو کہ آپ اپنی ملاحوں پر سب سے پہلے خود عمل کرتے ہیں“ باپو نے اس کا جواب دیا تھا کہ ”میں ایشور سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ مجھے اس کا موقع اور توفیق (سو بھاگم) دے“

اسی طرح گاؤں کی دستکاریوں کو پھر سے جلانے کے آندولن نے بھی کوئی عملی صورت ہی نہ لی۔ کیونکہ رچنا تمک کام کرنے والوں میں سے جو جس کام میں لگا ہوا تھا وہ اسی کو اپنی حد اور اتی شری سمجھتا تھا۔ اس کی کسی دوسری طرف نگاہ ہی نہ جاتی تھی۔

کھادی کے کام میں باپو کے سب سے زیادہ کام کرنے والے لگے ہوئے تھے۔ باپو نے ان کو کھادی کے جو پاری روپ کو توڑ دینے کی صلاح دی اور یہ تھا کہ کھادی کی پیداوار کو بڑھانے کی چنتا

نہ کر کے اسے سوادلمین تک محدود کر دیں، یعنی ہر گاؤں اپنی ضرورت کا کپڑا خود بنائے۔ ان کام کرنے والوں نے باپو کی اس صلاح کو عملی نہیں سمجھا اور اپنے اپنے کاموں سے استعفا دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ باپو نے ان سے کہا کہ تم اپنا کام کر دو میں اپنے لئے دوسرے کام کرنے دے ڈھونڈھ لوں گا۔

یہ سارے پہلو باپو کے سامنے تھے۔ جہاں ملک کے مٹانے والی طاقتیں دن بدن زور پکڑتی جاتی تھیں وہاں تعمیری پروگراموں کی یہ کمزوریاں باپو کی سب میں بڑی پریشانی تھی۔ باپو برابر اپنی کٹھنایوں پر قابو پانے کے خیال میں ڈوبے رہتے تھے۔ ایسے پرانے نقشوں میں ادل بدل کرتے تھے اور پھر انھیں تجربے کی کسوٹی پر کتے رہتے تھے ہر طرح کوشش کی کہ وہ کسی آخری نتیجے پر پہنچنا چاہتے تھے۔ کانگریس بالکل اُن کے اثر سے باہر ہو گئی تھی اس سے اُن کے سارے پیمانے سمبندھ ٹوٹتے جا رہے تھے اور باپو کے سامنے یہ سوال تھا کہ کانگریس کے ساتھ نئے سمبندھ کن بنیادوں پر قائم کریں۔ بدول سے اُن کا دماغ دھیان کسی ایسے پروگرام کی کھوج میں تھا جس میں انکی ان ساری کٹھنایوں کا کوئی حص نکلتے اور وہ اپنی ساری شکلیوں کو ایک جگہ لے آئے اور اپنے سمبندھ کو ان میں سے ہر گردہ کے ساتھ اور دنیا کے اپنے مفاد کو پورا کرنے کی ایک زبردست اور آخری کوشش کریں۔

انت کہ باپو کی ان سب کوششوں کا نتیجہ دکھائی دیا۔ باپو کے سامنے ایک نئے سب سے جلے آندوان کا ڈھانچہ آگیا۔ جس کا بنیادی اُصول یہ تھا کہ دیش کے سارے رچنا نمک سنگٹھنوں اور آندوانوں کو توڑ کر ایک اکیلا سنگٹھن قائم ہو۔ گاؤں کی زندگی کے ہر پہلو کو الگ الگ نہ لے کر گاؤں کی پوری زندگی

میں ایک سدا چاری، مالی اور سماجی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس نئی تحریک کا ڈھانچہ مدتوں سے باپو کے سامنے بن چکا تھا۔ اور اس ڈھانچے کی چتر چارہ اکثر سنگرم گرام سبھا کے روبرو پیش کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد ان کے سامنے کیوں یہ سوال باقی رہ گیا تھا کہ وہ اس نئے آندہ دین کو دلش کے سامنے کس روپ میں رکھیں۔ پر ملک کی حالت انھیں دم بھر بھی مصلحت نہیں لینے دیتی تھی۔ پھر بھی باپو نے یہ ددھان تیار کر ہی لیا، اس کا مٹوہ بنانے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سرکاری کو دینے کے کچھ دن پہلے انھوں نے ددھان میں ایک رچنا ٹمک کا یہ کرتاؤ کی کانفرنس بلائے گا انتظام کیا تھا۔ اس ددھان سے صاف ظاہر ہے کہ کانگریس اسے منظور کرتی یا نہ کرتی، اس کے چلانے اور کامیاب بنانے کی ذمہ داری اسی کانفرنس کے کار یہ کرتاؤں کو اٹھانی پڑتی۔ کیونکہ معمولی راج کالج میں ڈولے ہوئے کانگریس واؤں کے لئے کوئی جگہ اس کی کمیٹیوں میں نہیں رکھی گئی تھی۔ باپو کے مرجانے نے یہ سارا قصہ ہی ختم کر دیا۔ اُن کے مرنے کے بعد کانگریس کے لئے اس ددھان کی طرف کوئی دھیان دینا باطل ٹمک تھا۔ رچنا ٹمک کام کرنے واؤں کے لئے اپنی موجودہ سٹھکوں میں یہ ددھان کیوں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے لئے ایک سمجھاؤ تھا جس سے اُن کا کوئی سبند نہ بنیں تھا۔ باپو کے مرنے کے بعد ددھان میں رچنا ٹمک کا یہ کرتاؤں کی کانفرنس ہوئی۔ ہو سکتے

تھا کہ اُس کے سامنے یہ سوال آتا۔ پُر اُس کا نفرنس کی باگ ڈور
کاٹگریس اور حکومت کے بڑے بڑے لوگوں کے ہاتھوں میں رہی۔
اس لئے اُس کا نفرنس کا ادھر دھیان جانے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔

سمگر گرام سیوا اور سواو کمیشن

ہم نے ادیر پور دکھانے کی کوشش کی ہے کہ باپو کے ستیا
گرہ اور رچاننگ پرد گرام کا اصل روپ کیا ہوا اور اُن میں کیا شبہ بندھ
ہے اور باپو نے اپنا یہ آخری ددھان کیوں بنایا۔ اس ددھان
میں ان ددوں کا دچا کیوں اور کس طرح رکھا گیا ہے۔ ہماری
شدھکار کی کوششیں اگر ستیہ اور اہنسا پر قائم ہیں۔ تو ان میں
یہ ددوں پہلو یعنی رچاننگ کام اور ستیا گرہ الگ الگ کئے
ہی نہیں جاسکتے۔ ہم نے یہ بھی کہا ہے کہ باپو نے بہت دن
سوچنے کے بعد ایسے نئے آند دین کو چلانے کے لئے بھی باپو
نے گاؤں ہی کو کینڈریا مرکز بنایا۔

یہاں آگے بڑھنے سے پہلے ہم دد شبہ دں کو صاف
کر دینا چاہتے ہیں۔ جو آج کل کے راج کاج اور ددھانوں میں
بہت برتے جا رہے ہیں۔ ایک سنٹرلائزیشن جسے کینڈری کرنا یا
مرکزیت کہتے ہیں۔ دد سراڈی سنٹرلائزیشن جسے کینڈری کرنا یا
غیر مرکزیت کہتے ہیں۔ پہلے کا مطلب یہ ہے کہ کسی دیش یا راج
میں راج کی ساری شکلیاں اور ادھیکار دں کو جہاں تک

ہو سکے ایک سنٹر، کینڈریا مرکز میں جمع کر دیا جا دے جس میں
دیش کمی مرکزی سرکار خوب بلوان ہو۔ دوسرے کا مطلب یہ
ہے کہ راج کی طاقت اور ادھیکاروں کو دور دور تک الگ
الگ علاقوں میں بانٹ دیا جا دے، جس میں ہر علاقے والوں
کو اپنے یہاں کے سب کاموں میں زیادہ سے زیادہ آزادی ہو۔

باپ کا یہ اہل دانشور تھا کہ جمہوریت یعنی لوک راج
میں مرکزیت کی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ مرکزیت دیش کی
دولت، طاقت اور وسیلوں کو بھڑے سے آدمیوں کے
ہاتھوں میں جمع کر دیتی ہے۔ لوک راج کا مطلب یہ ہے کہ یہ
سب آدمیوں کے ہاتھوں میں برابر پہنچ سکیں۔ انھیں کے شروع
سے آج تک آدمی کی ساری سماجی اور راج کا جی زندگی کا جھکاؤ
مرکزیت سے جمہوریت یعنی غیر مرکزیت کی طرف رہا ہے۔ تانا شاہی
(آلوکریسی) ملا شاہی (مقبو کریسی) رئیس شاہی (ارستو کریسی) ادھوان
شاہی (پلوکریسی) نوکر شاہی (بوکر کریسی) سماج داد (سوشلزم)
اور سامیہ داد (کمیزم) رہتے ہوئے دولت اور طاقت کے
حصے داروں کی گنتی برابر بڑھتی رہتی ہے۔

سچ یہ ہے کہ یہ سارا جھکاؤ انسانی برابری یعنی سچے بھائی
چارے کی طرف تیزی کے ساتھ جا رہا ہے۔ لوک راج
اور انسانی بھائی چارہ دونوں ایک ہی کھپائی کے دو
نام ہیں۔ لوک راج کا مقصد دنیا کی دولت، طاقت اور
وسیلوں کو سب انسانوں میں برابر بانٹ دینا ہے۔ ہزاروں

سال کا تجربہ نہیں یہ بتاتا ہے کہ اگر دولت، طاقت اور وسیلے کسی خاص گروہ کے ہاتھ میں جمع ہو جاتے ہیں تو وہ گروہ اُنھیں انصاف کے ساتھ اور انوارتھ ہو کہ سب حقداروں تک کبھی نہیں پہنچا سکتا۔ پھر یہ حقدار اپنا سنگٹھن کر کے اپنا حق اُس مرکزی طاقت سے پھین لینے کے لئے حد درجہ کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی اُن خونخوار راج کا جی انقلابوں اور طوفانوں کا کارن ہے جن سے انسانی دنیا کھلبلا رہی ہے اور یہ طوفان کسی طرح ختم نہیں ہو سکتے جب تک یہ بڑا رہ انصاف اور انسانیت کی بنیادوں پر پورا نہیں ہو جاتا۔

اسے پورا کرنے کی دو ہی سورتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ گروہ خود دولت، طاقت اور وسیلے اپنے ہاتھ میں لئے ہے اپنے اندر اتنا اونچا سداچار پیدا کرے کہ وہ جتنا کا انوارتھ اور دہشت سیوک بن جاوے اور اپنے لئے کسی طرح کا کوئی بجی قائم نہ دیکھ کر اور نہ اپنے ذریعے کسی دوسرے کو ناجائز فائدہ پہنچا کر ساری طاقت اور وسیلوں کو حقدار جتنا میں برابر برابر انصاف کے ساتھ بانٹ دے۔ پر ہم نے دیکھ لیا کہ کانگریس جیسی تہاگی جماعت بھی جس نے ۲۰ سال تک آدھے سے ادھے سداچار کی تعلیم پائی تھی۔ حکومت اور طاقت لینے کے بعد اس اونچے آدرش کو نہ نبھا سکی۔ اس سے ہمیں یہ آخری سبق ملتا ہے کہ یہ راستہ کھنچ اور تک بھگ ناممکن ہے اور دنیا کی یہ مصیبت مرکزیت کے رہتے ہوئے کسی طرح دور نہیں ہو سکتی۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ دکنندہ کی کرن یعنی غیر مرکزیت اس طرح آخری درجے تک پہنچا دی جائے کہ مرکزی حکمران کے ہاتھوں میں کم سے کم طاقت، کم سے کم دولت اور کم سے کم وسیلے رہ جا دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جتنا میں اتنی جاگرتی، اتنا سنگٹھن، اتنا سداچار اور اتنا آتم بن پیدا ہو جائے کہ وہ حکومت کو پوری طرح سداچار کے اصولوں پر چلنے کے لئے مجبور کر سکے۔ اس کے لئے جتنا کا اہنسا اور ستیہ کے راستے پر چلنا ضروری ہے۔ کیونکہ اہنسا کا راستہ نیائے اور انسانیت کے حدود کے اندر نہیں رہ سکتا۔

جنتا کے اندر یہ ادبچا سداچار ایک ہی حالت میں پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم جنتا کے دلوں میں لوک راج نکھاجا مطلب جما دیں۔ ہم جنتا میں یہ پکا دشواش اور بھار پیدا کر دیں کہ دنیا کی دولت، طاقت اور وسیلوں میں سب آدمیوں کا برابر کا حصہ ہے، اور ان چیزوں کا انصاف کے ساتھ بٹوارہ کسی صورت میں بھی اپنی ضرورتوں کو بڑھانے اور اپنے پردسیوں سے بڑھ کر آرام طلبی کی طرف جانے سے پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ بٹوارہ ہمارا سب کا دھرم ہے یہ ہمارے دین کا ایک حصہ ہے۔ اس دھرم کو پورا کرنے میں ہمیں ہر انسان کو اپنا سگابھائی کیوں شہدوں میں نہیں بلکہ مل میں بھی ماننا پڑے گا۔ دوسرا خاص پہلو یہ ہے کہ اس سے دنیا میں دولت اور وسیلے یعنی دھن دھانیہ کم ہیں اور ضرورت مندوں کی گنتی ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ اسلئے ہمیں کیوں نیائے کا ہی نہیں بلکہ نیائے سے بڑھ کر تیاگ کا بھی راستہ چھڑانا

چاہئے۔ اپنے سگے بھائی کے بھوکا یا تنگ رہتے ہوئے اگر ہم کوئی ایسی چیز اپنے قبضے میں رکھتے ہیں جو ہماری زندگی کے لئے اتنی ضروری نہیں ہے تو یہ نہ انسانیت ہے اور نہ انصاف اور نہ نیائے۔ یہ انیائے ہے اور ظلم۔ اس لئے ہمیں اپنی ضرورتوں کو کم سے کم کر لینا چاہئے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے اور اپنے پاس دوسروں سے زیادہ سامان رکھیں گے تو ہمارے اس سامان کو دیکھ دیکھ کر دوسروں کے دل میں دھیرے دھیرے ہم سے غصہ اور نفرت پیدا ہونا قدرتی ہے۔ پھر یہ ڈر ہے کہ وہ ہمیں نقصان پہنچانے اور مٹانے کے جائزہ اور ناجائز طریقے ڈھونڈھ نکالیں اور انھیں کام میں لادیں۔ ان کی گنتی بہت ادھک اور ہماری بہت کم ہے اس لئے انت میں ہیں بھی کھڑے ہیں رہنا پڑے گا۔ پرانی دنیا میں یہ باتیں اس واسطے چل سکیں کہ اس زمانے میں انسانی بھائی چاہئے اور لوگ راج کا اتنا زور شور نہ تھا۔ ان آدرشوں کا جو کچھ اثر تھا وہ سدا جاری اور خیالی دنیا تک ہی تھا راج کا جی اور آرتھک یا مانی جیون میں ان آدرشوں پر عمل کرنے کرانے کا خیال نہیں کے برابر تھا۔ اب دنیا بدل گئی ہے۔ اب لوگ ان آدرشوں پر دوسروں سے زبردستی عمل کرانا اپنا حق سمجھنے لگے ہیں۔ اس لئے زمانے کی ہوا کو دیکھ کر ہمیں بھی بدینا چاہئے جو دیش رائٹریہ گروہ اپنے آس پاس کی حالت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اپنے کو بدلنے کی یوگیتا اپنے میں سے کھو بیٹھے ہیں۔ وہ دنیا کی گری سے گری مصیبتوں میں پڑ کر آخر مایامیت ہو جاتے ہیں۔

اس لوگ راج کے دور میں جو ہم سب کو سگے بھائیوں کے ناتے

میں باندھنا چاہتا ہے، شاسک اور شائستہ، حاکم اور محکوم مالک اور نوکر، برہمن اور شودر، ادب و ادب اور پنچ، امیر اور غریب، زمیندار اور رعایا، اعلیٰ مالک اور مزدور اس طرح کے کوئی بھید بھاؤ قائم نہیں رہ سکتے، یہ سب بھید بھاؤ ہمارے سماجی جیون میں طاقت اور دولت کی مرکزی صورتیں ہیں۔ ان کا مٹا دینا دوسروں کے بھلے کے لئے ہی نہیں دنیا کی شائستگی کے لئے اور ہماری اپنی سلامتی کے لئے بھی ضروری ہے۔ اس لئے ادب پنچا سدا چار ہی وہ راستہ ہے جس سے ہر ایک کو دنیا کی اچھی چیزوں میں برابر کا حصہ پہنچ سکتا ہے۔ ہم ذرا گہری نگاہ سے دیکھیں تو ہمیں اچھی طرح دکھائی دے جائے گا کہ اس معاملے میں پردہ کا راد اور سوار کھ دوڑوں ایک ہی سٹے کے دو رخ ہیں۔ ہمیں اس سدھانت کو کہ ہر آدمی سے اس کی شکتی کے انو سار کام لینے چاہئے اور اسے اس کی ضرورتوں کے انو سار دنیا کی چیزیں دینی چاہئیں، انسانی زندگی کا سنہرا اصول اور سب سے بڑا دھرم سمجھنا چاہئے۔ اور اسے عملی روپ دینے کے لئے مرکزیت کے رشتے کو چھوڑ کر زیادہ سے زیادہ غیر مرکزیت کا راستہ پھرنا چاہئے اور دنیا کی نئی رہنما اور نئی تعمیر کی بنیادیں اذ پر سے نہیں بلکہ نیچی سے نیچی سطحوں سے اٹھانی چاہئے۔

بادی کی ہر سدھار یو جیا کو سمجھنے کے لئے ہمیں اذ پر کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اگر بادی کو کبھی نیشنلائزیشن کی طرف داری کرتے تھے یا یہ صلاح دیتے

تھے کہ دھن دانوں، راجاؤں اور سرکاروں کو اپنے کو جتنا کاٹری سٹی
 ماننا چاہئے تو اس کا یہ کارن نہیں تھا کہ وہ مرکزیت کے خلاف
 نہیں تھے، بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک مرکزیت کسی روپ میں
 بھی موجود ہے تب تک اس سے جو نقصان ہو رہا ہے اور ہونے کا
 ڈر ہے اس سے بچنے کے ہی سب سے اچھے طریقے ہیں۔ جہاں
 تک نئے سماج اور نئی دنیا کی رچنا کا سوال ہے وہاں تک باپو
 کے سامنے ہمیشہ حد درجے کی غیر مرکزیت رہتی تھی یہی کارن تھا کہ انہوں
 نے اپنے سب آئندہ لہزوں اور اپنی سب یو جادوں میں گاؤں کو ہی مرکز
 رکھا اور گاؤں میں بھی ہر آدمی کے اپنے سدھار پر سب سے زیادہ زور دیا۔
 باپو بھی سمجھتا کہ اور پارلیمنٹری راج کو مرکزیت کا سب سے
 بڑا بت مانتے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ ان سے سارے دلش میں دور
 ہمارے جیون کے سب پہلوؤں میں مرکزیت کا زہر پھیل جائے گا۔ وہ دیکھتے
 تھے کہ ہندوستان کے شہروں پر غلامی کا سکہ جم چکا ہے، پر گاؤں ابھی
 ایک درجے تک بچے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ گاؤں گاؤں میں ایسا
 سدا جاری مالی اور روحانی سنگٹھن پیدا کر دینا چاہتے تھے جو انھیں
 بچھمی سمجھتی کی غلامی سے بچا سکے۔ انھیں یہ بھی ڈر تھا کہ جب تک ہمارے
 گاؤں میں سنگٹھن ٹھیک نہ ہو جائے گا تب تک راج کی مرکزی شکتی انھیں
 اپنے مطلب کے لئے کام میں لاتی رہے گی اور دلش میں ہنسنا بھرے
 انقلابوں کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ اسی لئے باپو گاؤں کی زندگی
 کو ہر مرکزی اثر سے آزاد کر دینا چاہتے تھے۔
 باپو کے سامنے گاؤں کے غیر مرکزی راج کا جی جیون کا

ڈھانچہ کیا تھا اس کا ہم کچھ انومان ان پرانی پنپاتوں سے کہہ سکتے ہیں جو انگریزی راج کے ہزاروں سال پہلے سے اس دیش میں قائم تھیں۔ بھارت کی سمجھتا نے اپنی روحانی اونچائیوں اور مالی چکا چوندہ کے ساتھ ساتھ اپنے راج کا جی جیون کو بھی ایسے عجیب سانچوں میں ڈھالا تھا جس کی مثال دنیا کے کسی بھی دوسرے دیش میں ملنا کھٹن ہے۔ اس نے دیش کے مرکزی راج کو راشٹر کے سچے مالی، روزگاری سدا چاری اور راج کا جی جیون سے بالکل اونچا اور الگ کر دیا تھا، اس نے اپنی مرکزی حکومتوں کی ساری شان شوکت اور آڈمبر کو نلے رکھتے ہوئے بھی گاؤں کی زندگی میں لوک راج قائم کر رکھا تھا۔

باپو کی کتاب ”ہند سراج“ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستانی سمجھتا کے اس پہلو کے پورے جان کار تھے اور ان کے دل پر اس کا بڑا گہرا اثر تھا۔ اسی لئے انھوں نے جتنی سدھار کی یوجنائیں دیش کے سامنے رکھیں ان سب پر ان پرانی گاؤں پنچائتوں یعنی آزاد لوک شاہیوں (ریپبلکس) کا گہرا رنگ تھا پر اپنے اس جھکاؤ کو باپو شاید کبھی پہلے اتنا صاف صاف ظاہر نہیں کر پائے تھے جتنا سمگر گرام سیوا اور سوادھن کی یوجناؤں میں انھوں نے دکھایا ہے۔ سمگر گرام سیوا کا مطلب ہے گاؤں والوں کی آرتھک نیتک اور سب طرح کی ایک ساتھ سیوا اور اُنتی، سوادھن کا مطلب ہے ہر گاؤں والوں کا ہر بات میں اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونا، یعنی کسی بات میں بھی کسی باہر والے کا محتاج نہ ہونا۔ اپنے دیش کے

اتاس کے اس پہلو کو جو اس بات سے سمبندھ رکھتا ہے ہم نیچے دیتے ہیں۔

اتاس کے سب پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ہزاروں سال تک ہندستان کے ہر گاؤں میں پنچائتی راج قائم تھا۔ اس کا روپ یہ تھا کہ گاؤں کے لوگ اپنے میں سے کسی ایسے ایک آدمی کو جو اپنی نیکی، سچائی، ایمانداری اور دوسروں کی بے لاگ سیوا کے لئے گاؤں میں مشہور ہو، اس کی خوشامد کر کے اسے پنچ بننے پر راضی کر لیتے تھے۔ اسی طرح دوسرے چار پنچ چنے جاتے تھے۔ ان پانچ پانچ پنچوں کی یہ پنچائتیں گاؤں کی تعلیم، عدالت، صفائی، تندرستی اور رکشا کے سب کام کرتی تھیں۔ ان سب کاموں کو کرنے کے لئے بہت پرانے زمانے سے انھیں زمینوں کی معافیاں اور آسامیاں ملی ہوئی تھیں، جنھیں گاؤں کے خوشحال آدمی برابر بڑھاتے رہتے تھے۔ عدالت کی حیثیت سے انھیں اپنے دائرے کے اندر دیوانی اور فوج داری کے پورے ادھیکار ہوتے تھے۔ ان پنچائتوں کی سب سے بڑی سندرتا یہ تھی کہ یہ اپنے سارے کام میں کسی راج کا جی یا دوسری نمسکتی کے ادھین نہ تھیں۔ انھیں پوری آزادی حاصل تھی اور ان میں اتنی نمسکتی اور ان کے پاس اتنے وسیلے ہوتے تھے کہ وہ اپنے علاقے کی سب ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ اسی لئے باپو کے سوا مین کی انھیں جیتی جاگتی تصویر کہا جاسکتا ہے۔

ان پنچائتوں کے کام میں کوئی راجہ یا بادشاہ کبھی دخل نہ دیتا تھا۔ اس کا کارن یہ تھا کہ ہندستان کی سمبھیتانے راجہ کے سب ادھیکاروں کو کیوں راج کالج تک ہی محدود کر دیا

تھا۔ اخلاقی معاملوں میں، مذہبی معاملوں میں، سماجی، روزگاری اور تجارتی معاملوں میں راجہ نہ کوئی دخل دے سکتا تھا اور نہ ان کی روک تھام کے لئے کوئی قانون بنا سکتا تھا۔ ان ساری باتوں کا پر بندھ اور ان کے اصولوں اور نیموں میں ادل بدل کرنے کا کام مذہبی اور اخلاقی سنسٹھاؤں کے سپرد تھا جو خاص سدھانتوں اور آدرشوں کے اندر رہتے ہوئے ان میں سدھار یا بدلاؤ کرتی رہتی تھیں۔ راجہ کا کیول اتنا کام ہوتا تھا کہ ان کاموں کے ٹھیک ٹھیک اور بے روک چلنے میں مدد دے اور ان سنسٹھاؤں کے بنائے ہوئے نیموں اور ان کی آگیاؤں کا آدر اور مان رکھے۔ اس لئے ان پنچائتوں کے کام کاج میں کسی راجہ کے دخل دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

آج سے دو تین سو سال پہلے بھی سبھیتا کے اُبھار کا زمانہ آیا۔ اس سبھیتا کا راج کا جی ادھیکار دنیا میں پھیلنے لگا۔ ہوتے ہوتے اس کے قدم ہندستان تک پہنچ گئے۔ یہ بھی سبھیتا اپنے دیشوں کی سدا چاری اور دینی دھرمی شکیتوں کو مٹا کر کیول اپنی تجارتی اور راج کا جی پیاس کو بھلنے کے لئے دنیا میں پھیلی تھی۔ اس کے نیتاؤں کو اپنے اسی مطلب کو پورا کرنے کے علاوہ اپنے آدھین دیشوں کی سانسکر تک یعنی کلچری صورتوں اور ضرورتوں سے کوئی واسطہ نہ رہتا تھا، نہ ان کے ریت رواج اور دھرم کرم کا ان ودیشیوں کے دل میں کوئی آدر ہوتا تھا۔ دارن ہیستنگز کے زمانے میں جو ہندستان کا پہلا انگریز گورنر جنرل تھا، اس دیش کی یہ لاکھوں پنچائتیں جان بوجھ کر

ایک قلم توڑ دی گئیں۔ دارن ہسٹنگز نے ایٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کے نام اپنے ایک خط میں ان پنچائتوں کے بارے میں لکھا تھا۔ "انسانی تاریخ کے دور کے پہلے سے ہندوستان کے ہر گاؤں میں پنچائتی راج قائم تھے۔ یہ پنچائتیں اپنے سارے راج پر بندہ میں اتنی آزاد اور خود مختار تھیں کہ اس دیش کے کسی راجہ یا بادشاہ نے کبھی اتنی ہمت نہیں کی کہ ان کے کام میں کسی طرح کا دخل دے۔ لوک مت کبھی اس طرح کے دخل دینے کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا..... میں نے ٹیڑھے یا سیدھے، جیسے بھی بن پڑا (بائی ہک اور بائی کرگ) ان پنچائتوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔"

انگریز اتھاس لیکھکوں نے ان پنچائتوں کو (دیج ریپبلکس) کہا ہے اور ان کے پر بندہ کی سندرتا کی بہت بہت تعریفیں کی ہیں۔ ان اتھاس لیکھکوں کی رائے ہے کہ ہندوستان کی بے مثال خوشحالی، دنیا بھر سے بڑھ کر صکھ شانتی اور امن و امان، یہاں کا دھرم پریم اور انسانیت، بلکہ اس دیش کی ساری بڑھی ہوئی کلچر انھیں پنچائتوں کی بنیادوں پر قائم تھی۔ انھیں پنچائتوں نے اس دیش کو امر بنا رکھا تھا۔ ان اتھاس لیکھکوں کی گواہی سے بڑھ کر گواہی ان پنچائتوں کی بے لاگ سیوا، ان کے نینک بل اور ان کے سند پر بندہ کی نہیں ہو سکتی، کیوں کہ عام طور پر اتھاس لیکھک ہندوستان کی کسی بات کو بھی سراہنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

ان پنچائتوں کی اس تصویر میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ پنچائتیں لوک راج یا لوک شاہی کا اچھے سے اچھا روپ ہوتے

ہوئے بھی ان ساری برائیوں سے پاک صاف تھیں جو پارلیمنٹی راج اپنے ساتھ دنیا میں لایا۔ ان پنچائتوں کی راج کا جی زندگی میں وہ ساری باتیں موجود ہیں جنہیں ہم 'ڈیموکریسی' یعنی لوک راج کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ اس لئے یہ پنچائتی راج مرکزی حکومت کے ہوتے ہوئے بھی دلش کے ۹۰ فیصدی رہنے والوں کو پوری آزادی کے ساتھ اپنا جیون بنانے کا موقعہ دیتا تھا۔ ان پنچائتوں کے جیون میں اس 'سوراج' کی کچھ چھایا سی دکھائی دیتی ہے جس کا باپو سنا دیکھتے تھے۔ یہ بات کہ یہ پنچائتیں ہزاروں سال تک اس ملک میں قائم رہ چکی ہیں اور ابھی دو سو برس بھی انہیں ملے ہوئے نہیں ہوئے ثابت کرتی ہیں کہ اس دلش کے مٹی پانی میں وہ ساری چیزیں موجود ہیں، جن سے اس طرح کی مستحکامیں پیدا ہو سکتی ہیں، بڑھ سکتی ہیں اور پھل پھول سکتی ہیں۔ اسی سے ان کا پھر سے زندہ ہونا بھی کوئی انوکھی یا ان ہونی بات معلوم نہیں ہوتی۔ ہماری پرانی گھاؤں کی زندگی میں وہ سارا ڈھانچہ موجود ہے جو باپو اپنی سنگرام سیوا اور سواد مبن کے آندولنوں سے ہندستان کے ۷ لاکھ گھاؤں میں پھر سے چمکانا چاہتے تھے۔

سما جاسکتا ہے کہ بقی دنیا کے سپنے دیکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اتنا اس اپنے پیر پیچھے کو نہیں ہٹاتا اور جو لوگ اتنا اس کے پیر پیچھے کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ ہمیں بھروسہ ہے کہ باپو کے سنگرام سیوا اور سواد مبن کی یوجناؤں کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد آدمی کے دل میں اس طرح کی شکنا نہیں رہ سکتی۔

باپو کی یہ یوجنائیں نئے دچاروں، نئے بھاؤں اور نئے ڈھنگ کے سادھنوں سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ دنیا کو آگے بڑھانے اور آدمی کو آدمی بنانے کی سب سے بڑی طاقت ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دنیا اپنی لاچاری، بے بسی اور کمزوری کی وجہ سے ان سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکے پرانت کو دنیا کو انھیں سے مدد لینا ہوگا، کیوں کہ انسانی ترقی اور مانو وکاس کی یہی آگے کی سیڑھی ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ جو نقشہ باپو نے اپنے نئے ودھان میں رکھا ہے وہ ہمارے گاؤں کے جیون کو اُسی سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے جس میں یہ پُرانی پنچائیتیں ڈھالی ہوئی تھیں۔ اتنا ہی نہیں وہ اس سے بہت آگے جانا چاہتا ہے۔ وہ کیول پُرانی خوش حالی راج کا جی آزادی، اور سدا چاری اونچائی کو ہی پھر سے لانا نہیں چاہتا، بلکہ وہ اُس روگ کی بھی جڑیں کاٹ ڈالنا چاہتا ہے۔ جس کے کارن یہ سب چیزیں برباد ہوئیں۔ ان پنچائیتوں میں پارلیمنٹری راج کی کوئی بُرائی نہیں۔ ان کی نمائندگی سچی نمائندگی ہے۔ ان کے چناؤ کے ڈھنگ میں نہ کسی کا پیسہ لٹا ہوا اور نہ کسی کا چلن گرتا ہے۔ ان کے راج کا جی جیون میں مرکزی سرکار کو دخل دینے کا کوئی ڈر نہیں رہ جاتا۔ سچ یہ ہے کہ ان میں سچے لوگ راج کے سب گن موجود ہیں۔ انکی برکت سے دلش کی نوے فیصدی جتنام مرکزی سرکار کے ہوتے ہوئے بھی پوری آزادی کے ساتھ اپنا جیون بتا سکتی ہے۔ یہ سب باتیں کسی اور یوجنا میں ملنا ممکن ہے۔

بران پنچایتوں میں یہ سب اچھائیاں ہوتے ہوئے بھی ہم انکی اس بنیادی کردی سے آنکھ نہیں بچا سکتے کہ اس سے کے ایک معمولی سے حاکم نے ان کی ہزاروں سال کی بے لاگ سیوا کے بعد دم کے دم میں مٹی کے ایک گھروندے کی طرح انھیں خاک میں ملا دیا۔ اس دیکھ بھری گھٹنا سے ہمیں بہت بڑا سبق ملتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان پنچائتوں کے ساتھ ساتھ وہ چرخا جو یہاں کی لاکھوں ہنوں کے گزارے کی ذمہ داری اپنے اوپر لئے تھا، گاؤں کی وہ ساری دستکاریاں جو یہاں کے کروڑوں سیدھے سادے اور محنتی کسانوں اور کاریگروں کا جیون میں ساتھ دیتی تھیں پنچائتوں کے ساتھ ساتھ انگریزی راج کی گھانک نیستی کا شکار ہو گئیں۔ یہ گھٹنا ماٹو جیون کے اُس بنیادی سوال کو ہمارے سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے کہ روحانی اور سدا چاری شکیتاں دنیاوی اور مادی شکیتوں سے منکر لے سکتی ہیں یا نہیں، اور اگر لے سکتی ہیں تو کیسے؟ کیا انسانی زندگی کے قائم رہنے اور اُنتی کرنے کے لئے اُس کا دُنیاوی، دھوکے فریب کی اور لاندہی طاقتوں کی چھایا ہی میں پلنا اور بڑھنا ضروری ہے؟

باپو کے لئے یہ کوئی نیا سوال نہیں تھا۔ اُن کا جیون ثابت کرتا ہے کہ ہندوستان کی پُرانی سبھیتا نے باپو کو اسی سوال کا عملی حل دنیا کے سامنے رکھنے کے لئے جنم دیا تھا۔ اسی سوال کے حل کے لئے باپو نے اپنی یوجنایں اور اپنے نئے ہتھیار دنیا کے سامنے رکھے ہیں۔ انگریزی راج کی اُن حیوانی شکیتوں سے، جنہوں نے پُرانی پنچائتوں اور سارے دیش کو بربادی کے

ساتھ ملایا، ہم نے باپو کی روحانی اور سدا چاری نمکیتوں کو ٹکراتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اپنے دیش واسیوں پر اور ساری دنیا پر ان نمکروں کا نتیجہ بھی ہمیں معلوم ہے۔ اسی ستیاگرہ کی شکتی کو جس نے انگریزی راج کی طاقت کو ہلا دیا تھا باپو ہندستان کے گاؤں گاؤں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ باپو کے سمگر سیوا اور سواد لبن اسی شکتی کو بنگانے کے طریقے ہیں۔ اس سمگر سیوا کا جو روپ باپو نے اپنے لئے ددھان میں دیا ہے اسے ہم نیچے دیتے ہیں۔ —

۵۔ ہر کام کرنے والا گاؤں کا اس طرح سنگٹھن کر چکا کہ ہر گاؤں اپنی کھیتی اور دستکاریوں کے ذریعے اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو سکے اور اپنا سارا کام خود چلا سکے۔

۶۔ وہ گاؤں کے لوگوں کو صفائی رکھنا اور تندرست رہنا سکھائیگا اور اس میں تندرستی کے بگڑنے اور بیماری پیدا ہونے کو روکنے کے لئے پہلے سے سب ترکیبیں کرے گا۔

۷۔ وہ ہندستانی تعلیمی سنگھ کی طے کی ہوئی نیتی کے انوسار، نئی تعلیم کے ڈھنگ پر، جنم سے لے کر موت تک گاؤں والوں کی تعلیم کا پر بندھ کرے گا۔

۸۔ اپنے دائرے کے اندر گاؤں کے ہر آدمی کے ساتھ وہ خود میل ملاپ رکھے گا۔

ہم نے سمگر سیوا کی کیوں والی، تعلیمی، اور تندرستی سے سمبندھ رکھنے والی دغاؤں کو نقل کیا ہے۔ اس کے سماجی اور راج کا جی پسلو کی چرچا ہم بعد میں کریں گے۔

ادھر کی پہلی تین دغاؤں میں سے ہر ایک کا ایک اتھا ہے۔

برسوں سے یہ باتیں دیش کے سامنے ہیں۔ باپو کے بڑے سے بڑے اندولوں کے ساتھ ان کا سمبندھ رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک پر بہت سی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔ سسے سے پر دیش کے بڑے سے بڑے نیناؤں نے ان کے بارے میں اپنے دچار بھی پرکٹ کئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر اتنا سامہتیہ جمع ہو گیا ہے کہ اُس کی مدد سے گانوں کے جیون کے سارے پہلوؤں اور گانوں والوں میں کام کرنے کے باپو کے نئے طریقوں کی پوری پوری جان کاری حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس لئے ہم یہاں انھیں ادھک بیان کرنا نہیں چاہتے۔ ہم اُن کے اصولی پہلوؤں کی ہی چرچا کریں گے۔

ادپر کی دفعہ ۵ میں باپو نے گانوں کی کھیتی اور دشتکاریوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی بات کہی ہے۔ یہ باپو کا سارے دیش کے لئے آدھک پروگرام ہے۔ اس کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ باپو راشٹر کے جیون میں سداچار اور راج کاج کو ایک دوسرے سے الگ نہ دیکھتے تھے۔ وہ جیون کے ہر پہلو کو اور ہر کام کو سداچار کی کسوٹی پر کتے تھے اور جیون کے ہر پہلو کی ادبچی چوٹیوں تک سداچار کے اصولوں کے راستے ہی پہنچنا چاہتے تھے۔ انکی یہ بھی رائے تھی کہ جیون کے کچھ تھوڑے سے سیدھے سادے اصول ہماری سب ضرورتوں کو پورا کرنے اور ہمارے آپس کے سمبندھوں کو ٹھیک ٹھیک طے کرنے کے لئے کافی ہیں۔

ایک بار کسی ایکونوک سوسائٹی نے باپو کو اپنے یہاں ایکونوکس یعنی مالیات (ارتھ شاسٹر) پر اپنے دچار پرکٹ کرنے کی دعوت دی۔ اسکے لئے اس دیا کے آجکل

کے کچھ جانکار باپو سے ملنے گئے۔ بات چیت میں انھوں نے نئے نئے اصول اور آج کل کے ارتھ شاستر پنڈتوں کے نئے نئے نام باپو کے سامنے پیش کئے۔ باپو چپ بیٹھے سب سنتے رہے۔ جب اُن لوگوں نے دیکھا کہ یہ کچھ جواب ہی نہیں دے رہے ہیں تو انھوں نے یہ سیدھا سوال باپو سے کیا کہ آپ ان ارتھ شاستر پنڈتوں اور اُن کے الگ الگ اصولوں میں سے کسے ٹھیک سمجھتے ہیں۔ باپو نے جواب دیا کہ 'بھائی میں نے تو ان سب کا کبھی نام بھی نہیں سنا، وہ لوگ دنگ رہ گئے۔ پوچھا کہ آخر آپ بھی کسی کتاب یا لیکچر کو اس دویا میں پرمان مانتے ہیں۔ باپو نے کہا 'ضرور' انھوں نے کہا کہ کیا ہم وہ کتاب دیکھ سکتے ہیں۔ باپو نے کہا 'ضرور' اور اپنا بستہ کھول کر اس میں سے بائبل نکال کر اُن کے سامنے رکھ دی۔

سچ باپو کا دچار تھا کہ حضرت موسیٰ کے اس حکم یا اُن سے بھی تھوڑے ہیں گیتا کے پانچ اصول جن پر دنیا کے سب دھرم مذہبوں کی سرگئی ہوئی ہے، جیون کے ہر پہلو اور آدمی کے ہر کام اور اسکی ہر بات کو ٹھیک رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ دنیا کا ہر آدمی انھیں جانتا ہے۔ جھوٹ ست بولو، چوری نہ کرو، کسی کو مار دمت، زنا نہ کرو، سب کے ساتھ پریم اور برابری کا برتاؤ کرو۔ یہی وہ تھوڑے سے بنیادی اصول ہیں جن پر آدمی کا سارا جیون اور دنیا کی ساری سمجھتا یکی، ساری کلچر اور سنسکرتیاں قائم ہیں۔ ضرورت کیوں اس بات کی ہے کہ آدمی کے اندر وہ نیتک شکتی پیدا کر دی جائے کہ جن سے اس کا سو بھاؤ ہی ایسا بن جائے کہ وہ ان اپنے

اصولوں پر عمل کرنے کو مجبور ہو۔ یہ نفعی آج کل کی یونیورسٹیاں کالج یا اسکول پیدا نہیں کر سکتے۔ کوئی تعلیم چاہے وہ کتنی بھی اونچی سے اونچی کیوں نہ ہو جب تک دھرم، اور نیکی پرست نام نہ ہو، آدمی میں اس طرح کا سو بھاد اور اس طرح کے گٹھ اڑیکہ نہیں کر سکتی۔

بھی سبھیتا نے سدا چار کی ایک بالکل نئی کسوٹی سنار کے سامنے رکھ دی ہے۔ اُس نے آدمی کی زندگی کے آرتھک پسلو کو اصلی زندگی مان کر باقی سب پہلوؤں کو اُس پر قربان کر دیا ہے۔ سگے کو اور اپنے اپنے سوار تھ کو اُس نے دنیا کا مذہب بنا لیا ہے۔ ادھارتا کی مانگ ہر آدمی کا دین دھرم اور ایمان ہو گیا ہے، اور ہر جاگیا مانجانہ طریقے سے اپنا مقصد پورا کرنا ہر آدمی کا نیک آدرش ہو گیا ہے۔ بھئی سبھیتا کی اس بھینکر غلط کاری سے ساری انسانی دنیا کی مالی اور روزگاری سطحوں کے نیچے قیامت پیدا کرنے والی آگ کی شعلیں بچھ گئی ہیں۔ ان سے ہماری ساری زندگی ہی ایک جواڑ کھیں بہاؤ بن گئی ہے۔ باپو چاہتے تھے کہ یہ آگ ہماری نگاؤں کی زندگی تک نہ پہنچ سکے، کیونکہ اگر یہاں کے چالیں کروڑ آدمیوں میں یہ آگ بھڑک اٹھی تو دنیا کے لئے اسے بھانا بہت کٹھن ہو جائے گا۔ باپو مانستے تھے کہ اس آگ کو بچھانے کا کیول ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ سب سادگی اور سواو لبن کا راستہ پکڑیں اور سدا چار کے بنیادی اصولوں سے مدد لیں۔ اس طرح ہی ہم بچیم کی آگ برسانے والی مالی آندھیوں سے اپنے کو بچا سکتے ہیں۔

ہم نے جان بوجھ کر اپنے سماجی جیون کو ایک ایسی لگاتار کھینچا
تانی اور جنگ کی شکل دیدی ہے جو ساری دنیا کو اپنے اثر میں لئے
ہوئے ہے اور جس میں ہر آدمی دوسرے کا بیری، ہر ایک اپنا اپنا
مورچہ سنبھالے ہوئے ہے اور دوسرے کی طرف سے اُسے ہر دم یہ
ڈر لگا ہوا ہے کہ وہ دوسرا اس کے فلاح اپنا مورچہ سنبھالے ہوئے
ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے کہتے رہتے ہیں کہ انصاف سے کام لو
آپسی جنگ سے کسی کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ پر ایسی حالت میں سچے
انصاف ہو سکتا بالکل ان ہونی بات ہے۔ انصاف، پریم اور انسانیت
کی جوا میں ہی پیدا ہو سکتا ہے اور اسی میں ہی پنپ سکتا ہے۔ انصاف
تجلی ہو سکتا ہے جب ہم دوسرے کی بھوک اور اس کے تنگ کا اتنا ہی
خیال رکھیں جتنا اپنی بھوک اور اپنی ضرورتوں کا۔ آجکل پچھم کی ساری
راج کا جی پارخیاں اس آدرش کو مانتی ہیں اور اسی کے آدھار پر اپنے
قاعدے قانون بناتی ہیں۔ لوگ راج ہی چاہتا ہے۔ پر ایک طرف
یہ سارے قاعدے قانون ہیں جو کیول کاغذوں پر لکھے رہتے ہیں
اور دوسری طرف ہماری دنیا بھر میں پھیلی ہوئی مالی کھینچا تانی
اور ہماری آکے دن کی راج کا جی جنگیں ہیں۔ اس کا کارن یہ ہے کہ
ہم میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو اپنے سوارتھ اور اپنی
اچھاؤں کے قلعے میں بند کر لیا ہے۔ دوسری کی اچھاؤں اور ان کی
ضرورتوں سے ہم بالکل بے پرواہ ہو گئے ہیں جیسے ہمارا ان کا کبھی کوئی
سمبندھ ہی نہیں رہا۔

گیتا کہتی ہے کہ یہ راستہ تمہیں سکھ شانتی یا سلامتی کی طرف نہیں
لے جاسکتا، تم سب بھائی بھائی ہو۔ ایک دوسرے کے ساتھ انصاف

ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے لئے تیاگ کا راستہ پکڑو۔ وہ کہتی ہے کہ جو کوئی کیول اپنے لئے چولھا جلاتا ہے وہ چور ہے۔ اگر ہم اس ایک اصول کے سارے پہلوؤں کو دل میں جمالیں، تو ہمیں سارے آرتھک جیون کے نئے سنگٹھن کے لئے بنیاد کا پتھر مل جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ دنیا میں ضرورت کی چیزیں کم ہیں اس لئے ہم کسی پیاسے پر بھی دولت اور طاقت میں مرکزیت پیدا کریں تو وہ ہمارے لئے ایک بہت بڑا خطرہ بنے بنا نہیں رہ سکتا۔ لوگ ہمارے اس خزانے کو دیکھ کر اُس میں حصہ بنانے کے لئے بھیجیں ہوں گے اور ہر اُچت اور اونچت ترکیب سے اپنی اچھا کو پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ اسلئے اپنے پاس ضرورت سے زیادہ سامان رکھنا چوری اور بُرائی ہے۔ اسی نے سب راشٹروں، گردہوں اور آدمیوں کو ہتھیار بند ڈاکو بنا دیا ہے۔ جب تک ہم اس گھانک روگ کا پورا علاج نہیں کرتے ہمیں اپنے دکھوں سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔

باپو نے سابرمتی ستیاگرہ آشرم کے سب آشرم والوں کو ایک بار جمع کر کے اُن سے کہا کہ، ”ہمیں یہاں اتنے دن ہو چکے اب میری کچھ میں ہم سب کو اپری گرہ کا برت لے لینا چاہئے، جس میں ہم سوا دہائی ہو جاویں اور دنیا کی کسی چیز کے محتاج نہ رہیں۔ اپری گرہ کا مطلب ہو دنیا کی کسی بھی چھوٹی بڑی چیز کو اپنی ملکیت نہ ماننا۔ آشرم و اسی پرش کر سوچنے لگے۔ باپو نے انھیں ایک دن سوچنے کے لئے دیا۔ دوسرے دن پھر سب جمع ہوئے۔ باپو کے پوچھنے پر ان میں سے ایک بھی اپری گرہ کا برت لینے کو تیار نہ ہوا۔ باپو نے

کہا۔ " میں تم پر زور نہیں ڈالتا، بد میں آج سے اپری گره درت لیتا ہوں۔" اس کے کئی برس بعد باپو نے انگلینڈ کے مانچسٹر شہر میں وہاں کے مزدوروں کے سامنے ایک دیاکھیان دیا تھا جس میں انھوں نے ان سے کہا تھا۔ " میں اپری گره کا رت سے چکا ہوں پھر مجھ کو آپ دیکھتے ہیں میں یہ چادر اوڑھے اور لنگوٹی پہنے آپ کے سامنے کھڑا ہوں، یہ میری مجبوری ہے۔ اتنا ضرور ہر کہ اگر آپ میں سے کسی کو میرے یہ کپڑے پسند آجادیں اور وہ انھیں لے بھل گئے تو میں نہ اس کی رپٹ لکھاؤں گا اور نہ اس پر دعویٰ کروں گا۔" یہ اپری گره کا پورا رڈپ ہے۔

سچ یہ ہے کہ اپری گره غیر مرکزیت کی آخری میٹھی ہے۔ باپو کی ساری سمگر سیوا کی یہی جان ہے۔ یہی آدرش وہ گاؤں، شہر، ضلع اور دیش سب کے سامنے رکھنا چاہتے تھے۔ راشٹر کی زندگی میں بھی وہ یہی کرنا چاہتے تھے۔ کوئی دیش جب تک سہی معنوں میں اپری گرہی نہیں بنے گا اور اپنی ضرورتوں کے لئے دوسروں کا محتاج رہے گا تب تک اسے سچے ارتھوں میں راج کا جی یا مالی آزادی مل ہی نہیں سکتی۔

باپو کے اپری گرہی ہوتے ہوئے بھی کیونسٹ جیسی کچھ پارٹیاں انھیں پونجی داد کا ایجنٹ کہتی تھیں۔ دکھ ہے کہ یہ لوگ انھیں سمجھ ہی نہ سکے۔ کیونزم یعنی سامیہ داد ہندو دھرم کے اسی اپری گره رت کو سامی پیمانے پر نیک نیتی کے ساتھ علی جاہ پہنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ پر دوسری راج کا جی پارٹیوں کی طرح یہ بھی اس آدرش تک جو حد درجے کا غیر مرکزی آدرش ہے، حد درجے کے مرکزی ڈھنگ سے پہنچنا چاہتا ہے۔ اس اُدیشیہ تک

پہنچنے کے لئے کیوسٹ سارے راسٹر یا قوم کی بلکہ ساری انسانی قوم کی ایک مرکزی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ساری دنیا کی دولت اور طاقت کو ایک مرکز پر جمع کر دینا حد درجہ کا پونجی واد ہے، آگے چل کر ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس ساری دولت اور طاقت کو برابر، برابر سب آدمیوں میں بانٹ دیں گے۔ باپو جب زمینداروں، راجاؤں، امیروں اور حکومتوں سے کہتے ہیں کہ تم اپنی دولت کے جنتا کی طرف سے ٹرٹی بن جاؤ تو کیوسٹ ان پر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بات انسانی سو بھاؤ کے خلاف ہے اور خود اسی انسانی سو بھاؤ پر اتنا بڑا ٹریسٹیوں کا محل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ طاقت اور دولت کے بل پر اس طرح کا محل بنایا جاسکتا ہے۔ دنیا اسی طرح کا محل بنانے کی طرف تیزی سے دوڑی جا رہی ہے۔ پر بن جانے کے بعد بھی یہ محل برابر ٹوٹتا اور پھر سے بنتا رہے گا۔ اس میں مضبوطی اور ٹکاؤ بن اسی پیمانے پر پیدا ہوگا جس پیمانے پر وہ حکومت اپری گره کے درت اور سواد لبین کے اصول کو جنتا کے جیون کا علی اور سچا حصہ بناسکے گی۔ باپو کا یہ نیا ودھان سیکڑوں برس کی خونی کھینچا تانی اور بربادی سے سماج کو بچائے جانے کا سب سے سستا اور سیدھا راستہ ہے۔ باپو کا سندیش ہے کہ اس نئی دنیا کی تعمیر جس کی جان لوک راج اور انسانی بھائی چارہ ہے، زمین سے شروع کرو، اس کی بنیادیں ایک ایک گاؤں کے اندر ایک ایک آدمی کے سداچار کو

ٹھیک کرنے اور اونچے سے اونچے لے جانے پر قائم گرد۔ باپو کا کہنا ہے کہ جب تک تم اس محل کو نیچے سے مضبوط بنیادوں پر نہیں اٹھاؤ گے یہ برابر تم پر گر کر تمہیں کچلتا اور برباد کرتا رہے گا۔

باپو نے اس ددھان کی دفعہ ۷ میں اس محل کی گہری سے گہری بنیادیں ڈالنے کی داغ بیل رکھی ہے۔ جس طرح سمگر سیوا اور سواد لمبن دنیا کی نئی تعمیر کی سچی بنیادیں ہیں اسی طرح باپو کی 'نئی تعلیم' سمگر سیوا اور سواد لمبن کی بنیاد ہے۔ جب تک ہم سمگر سیوا کے طریقے اور پروگرام اور سواد لمبن کے اصول اپنے بچوں کو انکی گھٹی کے ساتھ نہیں پلاتے تب تک دنیا کی کوئی بھی نئی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ دنیائے ماں اور بچے کی سچی تعلیم کی طرف ابھی تک بہت کم دھیان دیا ہے اور اُس کے ٹھیک ٹھیک مہتو کو بھی نہیں سمجھی ہے۔ اُسی کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا اتنے ادھک سٹپے اتنا ادھک سامان اور اتنے اونچے آدرش رکھتے ہیں جتنے اتنی دکھی اور برباد ہے۔ ایک طرف تو دنیا کا آدرش اس سے لوک راج اور انسانی بھائی چارہ ہے اور دوسری طرف دنیا بھر کے سب اسکول اور کالجوں میں وہ فوجی تعلیم دی جاتی ہے جو ایک دوسرے کی مار کاٹ، لوٹ پاٹ اور ہر طرح کی اخلاقی بُرائیوں کی جگہ ہے۔ دنیا بھر کے بچوں کو اسی مار کاٹ کی اور جیون کے ہر پہلو میں ایک دوسرے کے ساتھ بُری سے بُری لاگ ٹراٹ اور کھینچا تانی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جب تک یہ ساری یونیورسٹیاں اسکول اور کالج توڑ کر ختم نہیں کئے جاتے اور ان کی جگہ نئی

تعلیم اور نئی تربیت کا پر بندہ نہیں ہوتا تب تک دنیا اپنا آجکل کا رنگ ڈھنگ نہیں بدل سکتی اور نہ سچا لوک راج یا بھائی چارہ قائم کر سکتی ہے۔

باپو نے تعلیم کی بنیاد سوادلبن پر رکھ کر اس اتھاہ دھن، سسے، اور شکتی کو بربادی سے بچانے کا پروگرام دنیا کے سامنے رکھا ہے جیسے آجکل کے ہمارے اسکول، کالج، اسپتال اور راج کے سارے محکمے اس بیدردی کے ساتھ برباد کر رہے ہیں۔ بچوں کو کیول دماغی تعلیم دینا اور سادھتیا بڑھانا جب تک کہ ان کی بنیاد انسانیت اور سدا چار پر قائم نہ ہو، انھیں ان پرٹھ رکھنے سے زیادہ بُرا اور خطرناک ہے۔ ودیا اور بدھی دونوں زبردست شکتیاں ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح شریر کا بل ایک شکتی ہے۔ ہر شکتی کا ٹھیک اور غلط دونوں طرح کا استعمال ہو سکتا ہے۔ ودیا اور بدھی کی شکتی اگر کسی کے ہاتھ میں دے دی جاوے اور اُسکے سدا چار کو ٹھیک کر کے ان شکتیوں کے ٹھیک استعمال کا ڈھنگ اُسے نہ بتایا جاوے تو اس میں لگ بھگ ویسا ہی خطرہ ہے جیسا باپو کو ستیاگرہ کا ہتیار ہندستان کے ہاتھ میں دے کر پنا اس کا ٹھیک استعمال سکھائے۔ پجوری چورا کے سسے تجربہ ہوا تھا۔ یہ عملی تعلیم اگر ادھوری بھی رہ جائے تب بھی اس سے وہی غلط نتیجے پیدا ہوں گے جو ستیاگرہ کے غلط استعمال سے ہندستان میں ہوئے۔ جس طرح باپو نے ستیاگرہ کے ٹھیک استعمال کے لئے راجا جنک پروگرام تیار کیا تھا اسی طرح سگر سیوا اور سوادلبن کے ٹھیک استعمال اور ان کی کامیابی کے لئے نئی

تعلیم ضروری ہے۔ اس نئی تعلیم کو باپوں نے پورا پورا اپنے نئے ددھان میں شامل کر لیا ہے۔

ہماری آج کل کی تعلیم کے بُرے نتیجوں کا سب سے اچھا ثبوت اس تعلیم کے بڑے سے بڑے پنڈتوں اور جانکاروں کے عملی کارنامے ہیں۔ جو بڑی بڑی جنگیں آئے دن دنیا میں ہو رہی ہیں اور جن کے لئے دنیا اب بھی اتنے جوش کے ساتھ تیار کر رہی ہے اُن کا ہو سکتا ہونا آج کل کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے پنڈتوں اور سائنسدانوں کی دلی مدد کے ناممکن تھا۔ پرائمری اسکولوں سے لے کر بڑی سے بڑی یونیورسٹیوں تک سب میں فوجی تعلیم کے چرچے ہیں۔ اسی ہوا میں نئے لوک راج کی رچنا کی امیدیں کی جا رہی ہیں۔ اس سے بڑھ کر بد نصیبی دنیا کی جنتا کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔

باپوں نے اسی خطرے کو مٹانے کے لئے اپنی نئی تعلیم کا اندولن شروع کیا ہے۔ بچوں کے اسکولوں کو اس طرح کا روپ دینا کہ بچوں کی بنیادی ضرورتیں سب دیں۔ پر انھیں کے ہاتھوں پوری ہو سکیں اور بچوں میں اپنی تعلیم کا بوجھ دوسروں پر نہ ڈال کر سب خرچ خود کا لانا اور ان میں شروع اسی سے یہ دُچار پیدا کرنا کہ ہم خود اپنے پیروں پر کھڑے ہوں گے۔ اسی طرح سے اُن کے دل سے اونچ نیچ، امیر غریب، نوکر مالک کے وہ سب بھید بھاؤ نکال دینا جو لوگ راج اور انسانی بھائی چارے کے لئے سب سے بڑے کلنک ہیں۔ یہی باپوں کی نئی تعلیم کا اصلی مقصد اور اُس کا اصلی روپ ہے۔ جب تک بچے اس طرح کے دُچاروں کو ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا نہیں ہوتا، اور جب تک جیون کے ہر پہلو میں

کسی نہ کسی روپ میں اُسے انہیں چیزوں کی تعلیم نہیں دیکھتی تب تک دُنیا کی آج کل کی ہوا نہیں بدل سکتی۔

باپو کی نئی تعلیم کو ہمارے پڑھے لکھے لوگ کچھ اوزکھے ڈھنگ سے دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں بچوں کی تعلیم خرچ کی نگاہ سے خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ بچوں میں اس دُچار کا پیدا کرنا اور اسے سامنے رکھ کر تعلیم کا دیا جانا ہی اس مقصد کو حاصل کر لینا ہے۔ اور تعلیم کا جتنا خرچ بھی اس طرح سے نکل اُسے وہ بیاج کی طرح ہے۔ اس طرح کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے آدمی کا ایمانداری اور لگن کے ساتھ چپٹ جانا ایسے ایسے نتیجے پیدا کر دیتا ہے جن کی دُنیا کو کبھی امید نہ ہوتی تھی۔ کسی ادب کے مقصد کو، اگر وہ مقصد ٹھیک ہے تو، کوشش سے جٹ جانا کمزوری اور کم ہمتی ہے۔

باپو نے اپنے ودھان میں نئی تعلیم سے پہلی ہی دفعہ ۶ میں تندرستی اور صفائی کی چرچا کی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ باپو قدرتی علاج میں دشواس رکھتے تھے۔ دواؤں میں انہیں بالکل دشواس نہ تھا۔ صفائی کے معاملے میں وہ کہتے تھے کہ ہر آدمی کو اپنی ہر طرح کی صفائی خود کرنی چاہئے۔ اس میں کسی دوسرے کا محتاج ہونا اُس دوسرے پر ظلم کرنا ہے اور نیکی اور بھائی چارے کے اصولوں کے خلاف ہے۔ بیماروں، بچوں اور کمزوروں کی بات الگ ہے، ہم یہاں ان پہلوؤں کی ادھک دیا کھیا نہیں کرنا چاہتے۔ یہاں ہم اتنا کہہ دینا چاہتے ہیں کہ قدرتی علاج اور صفائی دونوں طریقے باپو کے سوا دوسروں کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔

جہاں تک اس ددھان کے سماجی پہلو کا سوال ہے باپو نے اس کے لئے کوئی الگ دفعہ نہیں رکھی۔ اور پہلوؤں میں تو بہت سی باہر کی چیزوں کے جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پر سماجی جیون کو تو اونچے سے اونچے لے جانے کے لئے سوائے ان پانچ اصولوں کے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ چوری نہ کرو، کسی کو مار دمت، زنا نہ کرو، سچ بولو اور ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا برتاؤ کرو، اس کے لئے اور کسی نئی جانکاری یا نئی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری سماجی زندگی کی سب سے بڑی کٹھنائی یہ ہے کہ ان اصولوں کو جانتے ہوئے بھی ہم ان کے عمل سے بچتے اور بھاگتے رہتے ہیں۔ اس لئے باپو نے انھیں اپنے ددھان کی کسی دفعہ میں شامل نہ کر کے انھیں سیوکوں یا کام کرنے والوں کے عملی جیون میں جگہ دی ہے۔

ددھان میں کام کرنے والوں کے لئے جو باتیں ضروری بتائی گئی ہیں انھیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ باپو ان سب دیواروں اور رکاوٹوں کو مٹا کر جو ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے الگ کرتی ہیں ساری انسانی دنیا کو ایک کٹھب میں ڈھال دینا چاہتے ہیں۔ یہی باپو کا سماجی پروگرام ہے۔ ہندو دھرم کا مول ہے۔ ”دسودھیو کٹھبکم“ یعنی ساری دنیا ایک چھوٹا سا کٹھب ہے۔ قرآن میں لکھا ہے کہ ”سب مخلوق یعنی پرانی ماتر اللہ کا کُنبہ ہے اور ان میں اللہ کو سب سے زیادہ پیارا وہ ہے جو اللہ کے اس کنبے کی سیوا کرتا ہے۔“ محمد صاحب اپنی نمازوں میں روزِ دُہرایا کرتے تھے ” میں گواہی دیتا ہوں کہ دنیا کے سب آدمی آپس میں بھائی بھائی ہیں“

حضرت عیسیٰ، بدم، زرتشت اور سب دھرموں کے چلانے والوں نے سب منشیوں کو ایک انسانی بھائی چارے کے سانچے میں ڈھال دینا اپنے مذہب اور اپنے مشن کا اصلی مقصد بتایا ہے۔ انھیں آپدیشوں کا نتیجہ ہے کہ یورپ میں اور پچھم میں سب جیوت راج کاجی پارٹیاں اس بھائی چارے اور انسانی برابری کو کم سے کم اپنے دائرے میں نیک نیکی کے ساتھ علی روپ دینا چاہتی ہیں۔ یہی اُن سب کا دعویٰ بھی ہے۔ لوک راج اسی دچار کا راج کاجی روپ ہے۔ سماج داد یا موکلزم اسی کا سماجی روپ ہے۔ سامیہ داد یا کمیونزم اسی کا آرٹھک روپ ہے۔ یہ سب بڑے سے بڑے پیمانے پر اسی انسانی بھائی چارے کو قائم کرنے کی کوششیں ہیں۔

پر اس سچے بھائی چارے کے قائم ہونے کے راستے میں دوزبردست کھٹنائیاں ہیں جن پر ہم ابھی تک قابو نہیں پا رہے ہیں۔ پہلی کھٹنائی تو یہ ہے کہ آج کل کی انسانی دنیا کے مذہبی، سماجی، مالی اور روزگاری سانچے بن جانے اور ان میں انسانی دنیا کے ڈھل جانے کے لاکھوں سال بعد آدمی نے پوری طرح مانو پریم اور انسانی بھائی چارے کی طاقت اور ضرورت کو سمجھ پایا۔ انسانی سماج کے یہ سانچے لوہے کے سانچوں سے بھی زیادہ کڑے ہیں انھیں بدلنا یا توڑنا آسان کام نہیں ہے۔ پر ہمیں یہ کام کرنا ہی ہے۔ دوسری اس سے بھی بڑی کھٹنائی یہ ہے کہ عام طور پر دنیا کے وہ مذہبی اندولن جو انسانی بھائی چارے کو قائم کرنا چاہتے ہیں اور خاص طور پر وہ راج کاجی اندولن جنکی ہم اوپر چرچا کر آئے ہیں اس مانو اندولن یعنی اس انسانی تحریک کو تلوار اور ہنسا کے بل پر

کامیاب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھ پاتے کہ کوی ایک جاتہ اور چیز ہے، اُس کے دل بھی ہے۔ اُسے دُنیا کے ہون و سستے میں توپوں اور ایم بموں سے کوٹ پیس کر انسانی بھائی چارے کے سانچے میں نہیں ڈھالا جاسکتا۔ یہ غلط طریقے آپس کی نفرتوں، عنفوتوں اور منہ اُڑدہی کی آگوں کو اور بھی بھڑکا دیتے ہیں۔ جہاں تک اس کھٹنائی کا سوال ہے وہاں تک باپوں نے جس پیمانے پر آدمی کی اس غلط چال کا مقابلہ کیا ہے اتنا شاید کسی دوسرے آدمی نے نہیں کیا۔

ہم جن آدمیوں کو شطیک مانتے ہیں ان پر عمل نہیں کرتے نہ ان کو اپنی زندگی میں کوئی جگہ دیتے ہیں۔ باپوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ اپنے ودھان میں بیکول ایسے سیوکوں کو ہی ذمہ داری سپرد کی ہے جو اپنے اصولوں پر پوری طرح عمل کرتے ہوں۔ ودھان کے اُس حصے کو جس میں سیوکوں کے گُن بتائے گئے ہیں ہم نیچے دیتے ہیں :-

”ہر کام کرنے والے کو اپنے ہاتھ کے کتے سوت کی یا آل انڈیا چرنہ سنگھ کی تصدیق کی ہوئی کھادی پہننے کی عادت ہونی ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شراب و سبب نشے کی چیزوں سے پرہیز کرتا ہو۔ اگر وہ ہندو ہے تو یہ ضروری ہے کہ اس نے اپنے نجی جیون میں اور اپنے کٹمب کے جیون میں، ہر شکل صورت میں چھوٹا چھوٹا بالکل چھوڑ دیا ہو اور وہ سامبر دائنک ایکتا کے آدرش میں دشواس رکھتا ہو، اور سب دھرم مذہبوں کے لئے اس کے دل میں برابر کا آدر اور مان ہو اور نسل، دھرم یا مرد عورت کے فرق کا خیال نہ کرتے ہوئے سب کو برابر کے ہوتے دیئے جانے اور سب کا برابر کا درجہ ماننے

جانے میں اُسے دشواری ہو۔“

باپ نے اتنے ہی کو کافی نہیں سمجھا کہ ان سیوکوں میں خود ہی یہ گن ہوں۔ انہوں نے سیوکوں کے کنبوں تک میں ان گنوں کو ضروری مانا ہے۔ جب تک آدمی سدھار کی کوششوں میں اپنے کنبہ والوں اور اپنے پڑوسیوں کے سدھار پر زور نہیں دیتا تب تک وہ دنیا کے سدھار کی طرف اتنی کامیابی کے ساتھ نہیں لگ سکتا۔ کانگریس کا سارا سدھار آندولن اسی سچائی کی زندہ مثال ہے۔ سو کانگریس والوں میں شاید تیس خود کھادی پہنتے ہیں، ان تیس میں بھی شاید پچاس فی صدی اپنے بی بی بچوں کو کھادی پہنانا ضروری نہیں سمجھتے۔ ہم مل کے کپڑے بیچنے والوں کی پکیننگ کرتے تھے اور انھیں ہزاروں اور لاکھوں کا نقصان پہناتے تھے پر ہم نے کبھی اپنے گھر اور محلے والوں کے کھادی پہننے پر زور نہیں دیا، نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے سارے سدھار آندولن بیجان ہو گئے۔ باپ نے اپنے اس ودھان میں اس کی کوپرا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر ہم انسانی بھائی چارے کو سچ جیتا جاگتا روپ دینا چاہتے ہیں تو ہمیں یہی راستہ پکڑنا ہوگا۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ جہاں تک کھیتی، دستکاری اور قدرتی علاج کے پروگراموں کا سوال ہے ہم یہاں ان کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ کیوں کہ ان سب باتوں پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور موجود ہیں۔ اس لئے اس ودھان کے جہان تک عمل کا سوال ہے وہاں تک اس میں کوئی خاص کھٹائی ہمیں دکھائی نہیں دیتی۔ سگر سیوا کے اس پہلو کو ہم یہیں ختم کرتے ہیں پر اس تعمیر کو

سواولمبن بنانے کے راستے میں بہت سی باہری اور راج کا جی کٹھنٹیاں ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہماری پُرانی گاڈیں پنچائتیں اپنے جیون کے مہر پہلو میں سواولمبن تھیں اور اب دنیا بدل گئی ہے اور ان پنچائتوں کو پوری آزادی ملنا آج بہت کٹھن ہے اس کٹھنائی کو دور کرنے کے باپو نے جو جو طریقے اس ودھان میں بتائے ہیں انھیں ہم اگلے حصے میں دیں گے۔

سواولمبن اور اسہ یوگ

پچھلے حصے میں ہم نے سنگر سیوا کا تعمیری پہلو دکھانے کی کوشش کی تھی۔ اس حصے میں ہم سنگر سیوا کے دوسرے پہلو اور سواولمبن کو بیان کریں گے۔

سواولمبن یعنی اپنے پیروں پر خود کھڑے ہونا بابلو کی ساری تعلیم میں سب سے بنیادی چیز ہے۔ باپو دینی تعلیم، تنک کو سواولمبن پر چلانا چاہتے ہیں جو دنیا کے لئے ایک نئی بات ہے۔ جب ہم آدمی کی ساری زندگی کو سواولمبن بنانا چاہتے ہیں تو بچے کے پیدا ہونے سے آخری دم تک اس اصول کو اگر عملی روپ دینے کی کوشش نہ کی گئی تو جیسا ہم کہہ چکے ہیں، مانو جیون میں کوئی اہلی انقلاب نہیں ہو سکتا۔

ساری دنیا، مذہب اور راج کا جی دونوں میں، تیزی کے ساتھ انسانی بھائی چارے کی طرف بڑھنا چاہتی ہے۔ پھر بھی اُسے

کامیابی نہیں مل رہی ہے۔ باپ کہتے ہیں کہ اس کارن یہ ہے کہ لوگوں کے آپسی سمبندھ اور ناتے عام طور سے اپنا بوجھ دوسرے پر ڈالنے اور دوسرے کا بوجھ خود نہ اٹھانے کی بنیاد پر بنے ہوئے ہیں۔ یہ انیائے ہے۔ اگر یہ انیائے ہمارے سماج سے دور ہو جائے اور ہر آدمی اپنا بوجھ خود اٹھانا اپنا دھرم سمجھنے لگے اور اس کا عادی ہو جائے تو دنیا کو سچے لوگ راج اور بھائی چارے کی طرف بڑھنے میں بہت آسانی ہو۔

ہم کچھ مثالیں دیتے ہیں۔ مالک مزدور، زمیندار کسان، حاکم محکوم، قلی مسافر، بھنگی، جھان جیسے سب سمبندھ ایسے ہیں جن میں ایک گروہ کا بوجھ دوسرے کے لئے اٹھانا اس کا فرض اور پیشہ بنا دیا گیا ہے۔ دوسرے کی مدد کرنا اور اس کا ہر طرح کا بوجھ اٹھانا بھی آدمی کا سب سے اونچا سدا چارہ ہے۔ یہ بات نیکی میں شامل ہے۔ اُسے ہم جتنا بریں اتنا ہی ہمارا سب کا بھلا ہے۔ پر یہ سیوا پریم اور تیاگ کی بنیاد پر ہونی چاہیے، کسی رواج یا قانون کے بل نہیں۔ یہ سیوا ویسی ہی ہونی چاہیے جیسے بچے کی سیوا ماں باپ کرتے ہیں یا دو بھائی ایک دوسرے کی سیوا کرتے ہیں۔ ایسی کسی سیوا میں کوئی پہلو انیائے یا زبردستی کا نہیں ہونا چاہیے۔ لوگ راج کے اس دور میں حاکم محکوم، مالک مزدور اونچ نیچ، چھوٹ اچھوت کے بھید نہیں چل سکتے۔ جتنی جلدی یہ بھید بھاؤ دور ہو سکیں اتنی ہی جلدی سچی لوگ شاہی اور بھائی چارے کا راج قائم ہوگا۔

سواولین کا پورا روپ یہ ہے کہ ہم اپنا سارا بوجھ خود

اٹھانا اپنا دھرم سمجھیں اور کوئی دوسرا اپنا بوجھ زبردستی ہم پر نہ لاد سکے۔ سودا ملین میں یہ دونوں پہلو ضروری ہیں۔ باپو نے اپنے ودھان میں یہ دونوں پہلو شامل کئے ہیں۔ اس ودھان کی پہنچائتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کو اپنے نجی اور سماجی جیون کی سب ضرورتوں کو پورا کرنے میں خود اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا سکھا دیں اور ان میں وہ شکتی پیدا کریں کہ ان کے اصلی بھلے یا سدا چار کے اصولوں کے خلاف کسی پڑانی بات کے جاری رکھنے یا نئی بات کے جاری کرنے پر کوئی بھی انھیں مجبور نہ کر سکے۔ باپو کے سودا ملین کا یہ روپ جیون کے نینک، سماجی اور آرٹھک پہلوؤں کے لئے ویسا ہی ضروری ہے جیسا راج کا جی پہلو کے لئے آزادی۔

باپو دیش کے ہر گاؤں میں یہی سچی آزادی قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس آزادی کو حاصل کرنے کے لئے تین باتوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ہر گاؤں میں گاؤں کے اس سے کے سادھنوں کے انوسار اپنی کھیستی، دستکاریاں، تعلیم، تندرستی سب کا پر بندھ ٹھیک ٹھیک اور ان طریقوں سے کیا جادے جو باپو نے بتائے ہیں۔ دوسری یہ کہ ہر گاؤں میں اس طرح کے سادھن پیدا کئے جادیں جو گاؤں کی بھلائی اور ترقی کے لئے ضروری ہیں، تیسری یہ کہ گاؤں کو ان سب باتوں سے پاک صاف کیا جادے جو گاؤں کی آزادی یا ترقی میں رکاوٹ ہوں۔ ان میں پہلی بات کی چرچا ہم قچھلے حصے میں

کر چکے ہیں۔ باقی دونوں باتیں ہم یہاں دیتے ہیں۔
 ہم کہہ چکے ہیں کہ ہمیں ویش کے نئے جیوں کی رچنا میں پڑانی
 پنچائتوں کو سامنے رکھنے سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ ان گاؤں
 پنچائتوں کو سواولہی بنانے کے لئے آج کل جن جن باتوں کی کمی اور
 ضرورت ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) جو معافیاں گاؤں کی تعلیم، تندرستی اور رکشا کے لئے
 انھیں پہلے ملی ہوئی تھیں اور جن سے ان کا سب نریج چلتا تھا
 انھیں پھر سے دلانا۔

(۲) گاؤں کے گورنوں کے لئے چم اگا ہوں کا اور دوسرا ٹھیک
 ٹھیک پر بندھ کرنا۔
 (۳) بچوں کی نئی تعلیم کے لئے مکان، سامان اور پڑھانے
 والے مقرر کرنا اور تیار کرنا۔

(۴) پینے اور سینچنے کے پانی کے لئے اچھے کنویں اور تالاب
 بنانا۔

(۵) گاؤں والوں کو اپنے اپنے کھیتوں کے سینچنے اور جوتے
 کی آسانی کی نگاہ سے ادل بدل کرنے یا نئے سرے سے مہندی
 کرنے کی پوری آزادی دینا۔

(۶) انھیں اپنے سارے جھگڑوں اور معاملوں کا خود فیصلہ کر لینے
 کی آزادی دینا۔

(۷) انھیں گاؤں کی رکشا اور سدا چار کو ٹھیک رکھنے کے
 پر بندھ میں پوری آزادی دینا۔
 (۸) جو لوگ گاؤں کے اندر سدا چار کے بنیادی نیوں

کو (پیشے سے بولنا ہے ایمانی نہ کرنا) توڑتے ہیں ان کو روکنا اور سدھارنا۔
(۹) مقامی ضرورتوں کے لئے جو کچھ کرنا ہو کر سکتا۔

باپو کی بیٹیائوں کا یہی آزادی کا اعلان ہے، یہی ان کا میگنا چارٹا ہے۔ ہم یہاں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ ظاہر ہے کہ گاؤں گاؤں اور علاقے علاقے کی الگ الگ ضرورتیں ہوں گی اور ہر گاؤں کے مردوں عورتوں اور بچوں کی گنتی کو سامنے رکھ کر الگ الگ پیٹے تیار کرنے ہوں گے اور کبھی کبھی الگ الگ جگہوں کے لئے کام کے الگ الگ ڈھنگ بھی نکالنے اور برتنے ہوں گے۔

اب ہم یہاں سوالین کی تیسری بات لیتے ہیں۔ یعنی گاؤں کو ان سب باتوں سے پاک صاف کرنا جو گاؤں کی آزادی اور بھلائی میں رکاوٹ ہوں۔ یہی سوالین کا سب سے نازک پہلو ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ دنیا میں بنانا اور بگاڑنا۔ گرہ ہٹانا اور توڑنا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خاص کر جب کہ ہمیں نئی رچنا سدھار کے روپ میں کرنی پڑتی ہے، اگر ہمارا جیون چاروں طرف سے ہمیں بگاڑنے والی شکلیوں سے گھر گیا ہے تو سدھار کی رچنا تک کو ششوں سے پہلے یا ان کے ساتھ ساتھ ہمیں ان بگاڑنے والی شکلیوں کو ہٹانا اور صاف کرنا پڑے گا۔ بد نصیبی سے ہمارے گاؤں کا آج کل کا جیون اس طرح کی بگاڑنے والی شکلیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہمارے گاؤں میں کئی سنگٹھن ایسے ہیں جو اوپر سے دیکھنے میں رچنا تک معلوم ہوتے ہیں پر جو ان کی بگاڑنے والی شکلیوں کو قائم رکھتے ہیں اور بڑھاتے

رہتے ہیں۔ اس طرح کے سنگٹھن انگریزی راج نے ہمارے پھلے کیلئے نہیں اپنے راج کاجی سوارتھ کو پورا کرنے کے لئے پیدا کئے تھے۔ یہی سبھیٹا میں دھرم کے چار چرن تھے۔ انگریزی راج نے ادھرم کے چار چرن قائم کئے۔ یہ چار پولیس راج، عدالت راج، پٹاری راج اور ادھیکاری راج ہیں۔ ادھرم کے ان چاروں چرنوں نے جو نقصان گاؤں کے جیون کو پہنچایا ہے اس پرکتہ میں لکھی جاسکتی ہیں۔ گاؤں کے سدا چار کو اور گاؤں کے مالی جیون دونوں کو انھوں نے مٹایا مبیٹ کر ڈالا۔

بابو انھیں چار چرنوں کے آدھار پر انگریزی راج کو ان راج یا شیطانی راج کہا کرتے تھے۔ خود کانگریس بھی جھپٹے تھیں سال تک ان چاروں کے ذریعے ہندستان کی بربادی کی دہ دھری کہانی دنیا کو سناتی رہی۔ لوگوں کو آشا تھی کہ انگریز یہاں سے جاتے سے اپنے ان چاروں چرنوں کو بھی اپنے ساتھ لے جاویں گے۔ پر وہ انھیں درٹے میں کانگریس کو دے گئے اور آج کانگریس خود ان چاروں راجوں کی مہاراجہ بنی ہوئی ہے۔

ہمارے گاؤں کی بد قسمتی یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ ہماری مرکزی اور صوبائی حکومتیں گاؤں کی کھیتی کی طرح طرح کی بھی مشینوں اور بجلی گھروں کے سپرد کرنے اور گاؤں کے لوگوں کو فوجی تعلیم دے کر اور ہتھیار بند کر کے گاؤں میں فوجی راج اور مشین راج جمادینے پر بھی تلی ہوئی ہیں۔ ہماری بھوی پر آج کل ان چھ پریت راجوں کا چکر چل رہا ہے۔ ایک طرف لوک راج کا زمانہ اور دوسری طرف یہ پریت راج کے دور سے، یہ دونوں

ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اگر ہمیں گاؤں کو زندہ رکھنا ہے اور انھیں پھلنے پھولنے کا موقع دینا ہے تو ہمیں کچھی سمجھنا کے ان پریت راجوں کو اپنے گاؤں سے بھگانا ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ گاؤں میں ان گھاتک شکتیوں کا راج ہوتے ہوئے کوئی سچی رچنا یا بھلائی کا کام کیسے ہو سکتا ہے۔ باپو نے اپنے ددھان میں ان درودھی شکتیوں سے لڑنے کی پوری داغ بیل ڈالی ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ رچنا تک کام اور ستیا گرہ ایک ہی سکتے کے دو رخ ہیں۔ رچنا کرنا اور درودھی شکتیوں، اگر وہ رکاوٹ ڈالیں، ٹکڑے لینا دونوں ساتھ ساتھ ضروری ہیں۔ باپو کے سوادلبن میں ستیا گرہ شامل ہے۔ گاؤں اپنی سچی آزادی فوجوں، قزاقوں اور گولوں کے بل حاصل نہیں کر سکتا۔ پر اگر گاؤں والوں میں آتم بل اور ستیا گرہ کی شکتی ہے تو دنیا کی قویں اور ہم اس کی آزادی کو نہیں چھین سکتے گاؤں میں تو ہزار پانچ سو آدمی ہوتے ہیں۔ پر ستیا گرہ کی مدد سے تو ایک آدمی بھی اکیلا اپنی آزادی قائم رکھ سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہو گا؟ خود ہمیں اپنی تعلیم تربیت اور اپنے جیون سے یہی خاص سبق سکھایا ہے۔ ہر درودھی شکتی کے پاس کسی کو قابو میں لانے اور اپنی مرضی پر چلانے کے لئے تین ہتھیار ہوتے ہیں۔ وہ ہیں تین طرح کے نقصانوں کا ڈر دکھائی ہے۔ ایک تن کا نقصان جیسے مار پیٹ یا چوٹ پہنچانا یا جیل، دوسرا مال کا نقصان جیسے جراثیم، بلی، بوٹ اور نیمسرا جان کا نقصان۔ انھیں نقصانوں کا ڈر نہیں غلام بنانا اور غلام رکھنا ہے۔ اگر ہم ان نقصانوں

سے نہ ڈریں تو کوئی ہمیں غلام نہیں بنا سکتا اور نہ کوئی زبردستی ہمیں اپنی مرضی پر چلا سکتا ہے۔ انھیں تین ڈروں سے آزاد ہو جانا اور دوسروں کے بھلے کے لئے ان نقصانوں کو خوشی سے سہیلنا سچا تیاگ ہے۔ جس پیمانے پر ہم انھیں سہنے کو تیار ہو جاتے ہیں اتنا ہی اونچا ہمارا تیاگ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں جو اس طرح کے تیاگ کے لئے تیار نہیں ہوتا اس کا ڈکھوں میں پھنسنے رہنا اور غلام بنے رہنا قدرتی ہے۔ اور جو جس درجے تک اس تیاگ کی شکتی اپنے میں پیدا کر لیتا ہے اُس کے جیون سے اسی درجے تک انیاؤں اور دکھوں کا مرٹ جانا ضروری ہے۔ سچ بلوچھے تو اس تیاگ کی شکتی کا نام ہی ستیاگرہ ہے۔

یہ ستیاگرہ کی شکتی اگر تلوار کی شکتی کی طرح کچھ آدمیوں میں بھی پیدا ہو جاوے تو وہ اپنا مقصد حاصل کر سکتی ہے۔ بڑے سے بڑے شہروں کو جی میں لاکھوں آدمی رہتے ہیں ڈرا کر قابو میں رکھنے کے لئے کچھ ہزار فوجی ہی کافی ہوتے ہیں۔ اسی طرح لوگوں کے دلوں سے ڈر کو نکال دینے کے لئے تھوڑے سے ہی پئے ستیاگرہی سارے سنسار پر اپنا اثر ڈال سکتا ہے۔ باپونے انگریزی راج سے ٹکری۔ ان کے اثر سے چھوٹے بڑے اور بھی ستیاگرہی دیش میں پیدا ہو گئے۔ باپو کے آندو دلوں میں جن لوگوں نے بھلے حصہ لیا ان کی گنتی کبھی پچاس ہزار یا ایک لاکھ سے ادھک نہیں ہوئی۔ پر ان کا اثر چالیس کروڑ آدمیوں پر ایسا اور اتنا بڑا کہ انگریزی راج کے پیر اکھڑ گئے۔ اس لئے اگر کسی گاؤں میں کچھ ہی ستیاگرہی پیدا ہو جائیں تو وہ گاؤں کے

گاؤں کو درودھی شکستوں کے ڈر سے آزاد کر کے ان میں وہ تیاگ پیدا کر دیں گے کہ جس کے سامنے تلوار اور انیائے اپنے دانت پیکر رہ جائیں گے، یا سر جھکا دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

باپو نے اپنے ودھان میں سوالین کے اندر ستیاگرہ کو شامل کر لیا ہے۔ ہم دکھا چکے ہیں کہ رچنا تمک کام بنا ستیاگرہ کی شکست کے ادھورا ہے اور ستیاگرہ کی شکست رچنا تمک کام سے بڑھتی ہے۔ اگر ہمیں اپنے گاؤں کو پولیس راج سے آزاد کرنا ہے تو اس کا رچنا تمک ڈھنگ یہ نہیں ہے کہ ہم تھاؤں اور عدالتوں کے سرکاری نوکروں سے ڈرا دھکا کر یا پھسلا کر استغفیٰ لے لیں۔ اس طرح کی باتیں ہماری کٹھنائیوں کو بہت بڑھا دیں گی اور آخر میں ہمیں بار کھانی پڑے گی۔ کارن یہ ہے کہ آج کل کی پولیس اور عدالتیں ہماری کچھ ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں اور ہم ان سے جھوٹی بچی مدد لینے کے محتاج ہو گئے ہیں۔ محتاجی ہی سچ ساری غلامی کی جڑ ہے اور اسی پیمانے پر سوالین غلامی سے آزاد کرنے کا ذریعہ ہے۔ کیوں کہ یہ محتاجی کو مٹاتا ہے۔ پھر اگر ہم پولیس راج اور عدالت راج کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو اس کا سیدھا طریقہ یہ ہے کہ جو کام ہم پولیس اور عدالتوں سے لیتے ہیں اُسے پورا کرنے کے لئے ہم آپ اپنا سنگٹھن اور پر بندھ کر لیں۔ اگر ہم اپنے آپس کے معاملوں اور جھگڑوں کو خود طے کرنے کا پر بندھ کر لیں اور پولیس کی مدد کے بنا اپنے علاقوں میں امن بنائے رکھنے کی صورتیں پیدا کر لیں تو یہ دونوں محکمے اپنے آپ بیکار اور نیکمے ہو جائیں گے، اور اگر ہمارا پر بندھ پورا اور پکا ہے

تو انھیں بالکل ہی بند ہونا پڑے گا۔

ان پریت راجوں یا ان محکموں کی غذا یا آہار وہ کام ہے جو ہم ان سے لیتے ہیں، وہ سہیوگ ہے جو ہم انھیں دیتے ہیں۔ اگر ہم ان کا یہ کھانا روک دیں تو سنسار کی کوئی شکستی انھیں زندہ نہیں رکھ سکتی۔ اسہ یوگ یعنی سہ یوگ (مدد) نہ دینا ستیا گرہ کا ہی ایک روپ جز۔ پر ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کیول اہنسا سے یا کیول اسہ یوگ سے انھیں ختم کر دینے کی آشا کرنا بے کار ثابت ہوگا اور ہماری کٹھنائوں کو بڑھا دے گا۔ اس سے ہماری ستیا گرہ کی شکستی بھی کم ہوگی۔ سچ یہ ہے کہ ہر اسہ یوگ کا روپ رچنا تک ہونا چاہئے۔ یعنی یہ کہ ہم ایک کے بعد ایک اپنی سب ضرورتوں کو پورا کرنے کی اپنے میں شکستی اور سادھن پیدا اور جمع کرتے رہیں۔ جتنی ہماری یہ کوشش کامیاب ہوگی اتنا ہی وہ محکمہ یا راج، جسے ہم مٹانا چاہتے ہیں، ختم ہوتا جائے گا۔ اگر ہم ہنسا کر دھ، بدنیتی یا جلد بازی سے کام نہ لیں تو ہمیں کامیابی ضرور اور جلد ملے گی۔ جلد بازی کام کو خراب کرتی ہے اور اس راستے کا سب سے بڑا خطرہ ہے۔

ہمیں اس بات کو اچھی طرح دل میں جما لینا چاہئے کہ ہمارا اصلی مقصد ان پُرانی پنچائتوں اور اس پُرانی سبھیتا کو، جس نے ان پنچائتوں کو جنم دیا تھا، ان میں ایک نئی جان اور نئی روح ڈال کر پھر سے قائم کرنا ہے۔ ہم نے اوپر دکھایا ہے کہ باپو کے ددھان کی پنچائتیں ستیا گرہ اور اسہ یوگ کی مدد سے کس طرح پوری راج کا جی مالی آزادی حاصل کر سکتی ہیں۔ بالکل اسی طرح یہ پنچائتیں پچھمی سبھیتا کی نینک غلامی سے دلش کو آزاد

کر سکتی ہیں۔ پچھلی سبھیتا کی اس غلامی پر ہی ہماری اور سب غلامیوں کے محل بنے ہیں۔ پچھلی سبھیتا ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم اپنے لائبہ کے لئے ایمان داری، بے ایمانی، بیچ بھوٹ سب سے ایک سا کام لے سکتے ہیں۔ یہی سبق ہمارے بہت سے نیتا حکومت کی پالیسی چلانے میں اور کانگریس کی پارٹی بازی کے کرشموں میں بڑے سے بڑے پیمانوں پر سکھا رہے ہیں۔ انگریزی عدالتوں نے ہمیں بھوٹ بولنے اور بھوٹا حلف اٹھانے کی تعلیم ایسی دی کہ دنیا کی کسی بڑی سے بڑی سنستھا یا بڑے سے بڑے سنگٹھن نے شاید ہی کبھی کسی کو دی ہو۔ پر ہماری حکومت کی کنٹرول کی پالیسیوں نے تو ان پالیسیوں کے چلانے والوں کی ابھی سے ابھی نیت ہوتے ہوئے بھی، بھوٹا فریب اور بے ایمانی پھیلانے میں کچھ برسوں کے اندر اتنا کام کر دیا کہ جتنا ان عدالتوں نے صدیوں میں بھی نہیں کر پایا تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو نفرت اور غصہ انگریزی راج کے خلاف صدیوں میں پیدا ہو پایا تھا وہ اپنی حکومت کے خلاف برسوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ پر ہمارے آج کل کے نیتا بے بس ہیں۔ وہ حکومت اور کانگریس دونوں کو پچھلی سبھیتا کی شیطانی چالوں اور بڑائیوں سے الگ نہیں کر سکتے۔ کارن یہ ہے کہ ان کے سامنے کوئی دوسرا راستہ ہے ہی نہیں۔ بالو کے راستے کو وہ ہوائی اور ان ہونی چیز سمجھتے ہیں۔

گاڈ کے لوگوں نے ابھی تک ادھرم کو دھرم مان لینا شروع نہیں کیا ہے۔ اس لئے اگر ان کے سامنے پچھلی سبھیتا کی ڈراؤنی

صورت اپنے پورے خونی رنگوں کے ساتھ رکھی جاوے اور حکومت اور کانگریس پر اس کے گھاتک اثروں کا نتیجہ دکھایا جاوے تو ناممکن ہے کہ ان کے دلوں میں بھگوان کا ڈر پھر سے پیدا نہ ہو، اور وہ کھلی بدکاریوں کے ڈر سے اپنے کو بچانے کی ضرورت محسوس نہ کریں۔ ہمیں انھیں سمجھانا چاہئے کہ باپوانھیں کبھی سمجھتا کی غلامی سے بچانا چاہتے تھے۔ کسی کی بھی غلامی سے بچنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اسے سہہ یوگ دینا بند کر دیں۔ ہم نے کہا ہے کہ ہمارا سہہ یوگ ہی وہ بھوجن ہے جو ہماری درودھی تسکنتی یا سنسٹھا کو جیوت رکھتا ہے۔ کبھی سمجھتا کو اگر ہمیں دلش نکالا دینا ہے تو ہم اس سے اپنا سہہ یوگ توڑ دیں۔ اس سے اس کا آپ ہی آپ خاتمہ ہو جائے گا۔ سہہ یوگ توڑنے کا سب سے سیدھا راستہ یہ ہے کہ ہم اپنی پُرانی سمجھتا کے ان پیارے اصولوں کو جیسے بیچ بولوا، چوری نہ کرو، مار پیٹ نہ کرو وغیرہ ان بنیادی اصولوں کو اپنے گھاؤں کے بھائیوں کے آپسی دیوار کا اٹل نیم بنالیں۔ جس طرح کسی منتر سے بھوت بھاگتا ہے اُسی طرح ان سادے ینموں پر ایمان داری کے ساتھ تم جانے سے کبھی سمجھتا اور اس سے پیدا ہوئے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔

دنیا کی کوئی اونچی مذہبی کتاب ایسی نہیں ہے جو ہمارے اس دعوے کی تائید نہ کرتی ہو۔ ابھی سو سال بھی نہیں ہوئے کہ ہمارے سارے گھاؤں کا جیون انھیں اصولوں پر چل رہا تھا۔ ساری دنیا کے اتہاس لیکھک ہمارے دلش کی اس خونی اور اس

دشیتا کی دل سے تعریفیں کرتے ہیں۔ اس لئے اس جیون کا واپس لانا ہماری سچی کوششوں کے سامنے کوئی اُن ہونی بات نہیں ہے۔ اگر ہم ایک بار اپنے اس کھوئے ہوئے جیون کو واپس لے آویں تو پُرانی پنچائنتیں، پُرانی سمجھتا، پُرانی شکتی اور پُرانی خوشحالی سب اپنے آپ واپس آجا دیں گے۔

اگر ہم اپنے میں ستیا گرہ کی شکتی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ان اصولوں پر کار بند ہونے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ گاؤں کی برادریاں ابھی زندہ ہیں۔ حقہ پانی انھیں بنائے رکھنے کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس سے بڑھ کر انسانی ہتھیار کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا اور ہزاروں سال سے یہ برابر اپنا کام کر رہا ہے۔ باپو کے سہ یوگ اور اسہ یوگ کا یہ حقہ پانی اور اس کا بند کر دینا ایک سُندر نمونہ ہے۔ اگر کسی گاؤں کے نیک لوگ آپس میں ایک دِل ہو کر اور سنگٹھن کر کے گاؤں کو بُرائیوں اور بدکاریوں سے پاک صاف رکھنے کا ارادہ کر لیں تو کیوں ان نیک لوگوں کا پریم بھرا اسہ یوگ ہی سب بُرائی کرنے والوں کو بُرائی چھوڑ دینے پر مجبور کر دے گا۔

پچھلی سمجھتا کا ایک زبردست بہاؤ آیا۔ ہمارے پاؤں اکھڑ گئے۔ مگر ہم نے پھر پاؤں جمائے اور اپنی پُرانی سمجھتا کے اصولوں اور طاقتوں کی مدد لے کر اس ودیشی حکومت کو مٹا دیا جو یہ طوفان اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ حکومت اپنا گھاناٹک اثر ہماری دیشی حکومت اور دیش پر چھوڑ گئی ہے۔ ہماری جس سمجھتا نے دو سو سال تک کچلے جانے کے بعد دنیا کی

سب سے بڑی مادی طاقت کو اپنی روحانی اور اخلاقی طاقتوں کی مدد سے مٹا دیا، یہ ناممکن ہے کہ وہ کچھ دنوں میں اپنی نئی دیشی حکومت پر قابو نہ پاسکے۔ ہماری آج کل کی دیشی حکومت کی تلواریں اور پولیس اسے بچا کر نہیں رکھ سکتیں۔ ٹھیک جیسے یہ انگریزی راج کو دہچاکیں۔ ہماری دیشی حکومت سقیمہ اور اہنسا، انصاف اور انسانیت، نمرتا اور سیوا کے راستے پر چل کر ہی بچ سکتی ہے۔ اس کی دولت، طاقت، ہمت اور سنگٹھن بنانیتک بل کے اور بنا انسانیت کے بالو کے محل ہیں۔ انھیں لوہے کے قلعے سمجھ لینا حکومتوں کے لئے سب سے بڑی بد نصیبی اور خطرہ ہیں۔ جرمنی اور جاپان دنیا کی وہ دو طاقتیں تھیں جن کی تلواروں کا دُنیا پر سکہ جما ہوا تھا اور جن کے دُنیا پر قبضہ پالینے کے سینے بالکل بے بنیاد نہیں تھے۔ لیکن آج ان کی تلواریں ٹوٹی پڑی ہیں، وہ گھائلوں کی طرح زمین پر پڑے تڑپ رہے ہیں۔ اور امریکہ، انگلستان اور دوسرے مترانشٹر انھیں جی بھر کر پیروں تلے کچل رہے ہیں۔ یہ دہی امریکہ اور انگلستان ہیں جو نہتے ہندستان پر اپنا قبضہ قائم نہ رکھ سکے۔ انگریز یہاں سے گئے ہیں تو ہماری فوجوں، ہوائی اور سمندری جہازوں، زہریلی گیسوں یا ایٹم بموں کے ڈر سے نہیں گئے۔ وہ گئے ہیں جتنا کہ اسہ یوگ اور سنیاگرہ کے ڈر سے۔ اور اگر آج بھی وہ ہمارے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں اور اپنی چالوں سے ہمیں اپنے جال میں پھرسے پھنسانے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ہم پر سیدھا قبضہ جمالینے کی ہمت نہیں کرتے، تو اس میں انھیں ہماری ”کھلونا“ فوجوں اور انگریزی جل سینا کے ٹوٹے پھوٹے جہازوں کا ڈر نہیں ہے۔

نہ انھیں روس کا ڈر ہے۔ انھیں بس ایک ہی ڈر ہے، اور وہ ہندوستان کی جنتا کے اسہ یوگ کا۔ اس پہلو پر ہمیں دھیان رکھنا چاہیے؛ اگر ویش کی حکومت اور جنتا دونوں اس پہلو پر غور کر کے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں تو ویش کے سارے دکھ درد بہت جلدی دور ہو جاسکتے ہیں اور ہمارا ویش ہمیشہ کیلئے دوسرے دیشوں کی آرتھک غلامی اور ان کی فوجوں کے ڈر سے آزاد رہ سکتا ہے۔

حکومت باپو کے ہوادلیمن کے سندیش کو سنے یا نہ سنے، جنتا کو ادھر دھیان دینا ہی چاہیے۔ کیونکہ اس کے سنے یا نہ سنے میں حکومت کا کوئی خاص نقصان نہیں۔ نقصان کیول جنتا کا ہی ہے۔ جنتا کو یہ سمجھنا چاہیے کہ لاکھوں برس کی کوششوں اور بربادیوں کے بعد آج وہ یوگ آیا ہے کہ جب دُنیا نے اسے ویش کا سچا بادشاہ مان لیا ہے۔ پر ابھی تک یہ کیول اصولی اور کاغذی مانتا ہے۔ دُنیا میں راجہ نہیں رہے پر رکت دیر راکشش کی طرح اُن کے خون کی ہزاروں بوندیں دُنیا پر گری ہیں اور بوندوں میں سے ایک راجہ کی جگہ سیکڑوں نئے راجاؤں نے جنتا کے نمائندوں کے روپ میں راج گدیاں لے لی ہیں اور بیچاری جنتا پہلے کی طرح دبی ہی چیری کی چیری بنی ہوئی ہے۔ اگر جنتا پارلیمنٹی حکومت کی اصلیت کو پوری طرح سمجھ نہ لے گی تو اُسے اس کے جال میں پھنسے رہ کر پھلی کی طرح سدا تڑپنا ہوگا۔ اُس کا اس جال کو جلدی سے جلدی توڑنا اس کے بیون اور آزادی دونوں کے لئے ضروری ہے۔

اس جال کو توڑنے کے لئے سوائے باپو کے دکھائے ہوئے راستے کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اپنی پُرانی سمجھنا اور باپو کے سواولمبن کا سہارا لے کر جنتا کو اپنے دیش کا سچا راجہ بننا ہوگا۔ پارلیمنٹی راج کے ذریعے جنتا کبھی سچی راجہ نہیں بن سکتی ہمیشہ غلام ہی بنی رہے گی۔ دُنیا کی جو حکومت بھی فوجوں، بندوٹی، پولیس اور لائٹھوں پر قائم ہوگی اُس کی جنتا ہمیشہ غلام رہے گی اور وہ حکومت جنتا کی بادشاہ اور اُسے چوسنے والی رہے گی۔ جنتا کو یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ زمانہ جب فوجیں اور پولیس ڈاکوؤں، چوروں، ٹھکوں اور دوسرے مجرموں کو گرفتار کرنے کا کام کرتی تھیں، اب نہیں رہا۔ اب پولیس اور فوجوں کا اصلی کام راج کا جی پارٹیوں کو دبانا ہے۔ یہ پارٹیاں جنتا کے جسم کو چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں کاٹ کر انھیں اپنی سینا بنا لیتی ہیں اور انھیں سیناؤں کو اپنی درد دہی پارٹیوں یا حکومت کے خلاف لڑا لڑا کر مٹاتی رہتی ہیں۔ ان پارٹیوں کا کچھ نہیں جاتا۔ ہر طرف سے خون اور بربادی جنتا ہی کی ہوتی ہے حکومت جو مکھی لڑائی لڑتی ہے اور ان میں سے جنتا کے جسم کے ہر ٹکڑے پر اُس کی گولیاں اور لائٹھیاں برستی ہیں اور غضب یہ ہے کہ اس سارے خون خرابے کی اصلی غرض جنتا کا فائدہ بتایا جاتا ہے۔ یہ سب پارٹیاں اور ان سب سے بڑھ کر حکومت ان ظلموں میں اپنے آپ کو جنتا کا رکھشک اور سچا سیوک بتاتی ہے۔ جنتا بیچاری اپنی ناسمجھی اور بھولے پن سے اُن سب کی چالوں اور جھوٹے وعدوں کو نہ سمجھ کر ان کے لئے

اپنا خون بہاتی اور مال لٹاتی رہتی ہے۔ اس سے بڑھ کر اندھیر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور تماشا یہ کہ پارلیمنٹی راج پارٹی بندی کو ہی اپنی جان اور ایمان مانتا ہے۔ پنا دو ورودھی پارٹیوں کے پارلیمنٹی راج چل ہی نہیں سکتا۔ کچھی بندوں کا کہنا یہ ہے کہ پنا دو ورودھی پارٹیوں کے حکومت پارلیمنٹی خوبی کے ساتھ چل ہی نہیں سکتی۔ اس کی یہ دو پارٹیاں تعداد میں مچھلی کے انڈوں کی طرح اُن گنت بڑھتی ہیں۔ یہاں تک کہ دیش کا کونہ کونہ ان پارٹیوں سے بھر جاتا ہے جب تک دنیا کی جتنا اس پارلیمنٹی راج اور اس کے ان بچوں کا خاتمہ نہ کرے گی تب تک اس کے اسی طرح ٹکڑے ہوتے رہیں گے۔ یہ مٹی رہے گی اور اس کے خون کے دریا بہتے رہیں گے۔ یہ سب پارٹیاں جتنا کو ملک کا اصلی بادشاہ بتاتی ہیں۔ دنیا میں کسی بادشاہ کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے نہ کئے گئے ہوں گے۔ جیسے بیماری جتنا بادشاہ کے۔ ہر حکومت کے بڑے بڑے نیتا بھی ہر موقع پر اپنے اعلانوں، دیا کھیاؤں اور قانونوں میں اور طرح طرح سے جتنا کو اُس کے بادشاہ ہونے کا اعتبار دلاتے رہتے ہیں اور ان کا ہمیشہ یہ دعویٰ رہتا ہے کہ یہ جو کچھ کرتے ہیں جتنا کے سدھار اور بھلے کیلئے ہی کرتے ہیں۔ آج تک دنیا میں کسی نے اپنے بادشاہ یا مالک کا سدھار اور اُس کا بھلا بندوں، لائٹھیوں، جُر مالوں اور جیلوں سے نہ کیا ہوگا۔ یہ سارا اندھیر پارلیمنٹی راج اور اُس کی پیدا کی ہوئی پارٹیوں کا ہے جو ایک کے بعد ایک جتنا کے نمائندہ بن کر تخت پر بیٹھتی ہیں اور جتنا پر باری باری یہی اندھیر کرتی ہیں۔

جنتا اسے کیول اسی لئے برداشت کر لیتی ہے کیونکہ وہ ابھی تک بیچ بیچ کی بادشاہ نہیں بنی ہے۔ ابھی تک یہ دُنیا سے کیول اپنا بادشاہ بننے کا ادھیکار منوا پائی ہے۔ ابھی یہ تخت پر بیٹھی نہیں۔ ابھی اس میں بادشاہ ہونے کا سچا بھاؤ اور سرکاری کرپاریوں کو اپنا نوکر ماننے کا سچا خیال بھی پیدا نہیں ہوا۔ نہیں تو یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ اس کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ ہو اور یہ اُسے سہہ سکے۔ جب تک جنتا میں اتنی سمجھ، اتنا سنگٹھن اور اتنی شکست پییدانہ ہوگی کہ وہ اپنے کو بیچ مالک اور حکومت چلانے والوں کو اپنا سیوک مانے اور بنا سکے تب تک لوک راج کا نام لینا بے ایمانی ہے۔

سچے لوک راج کا پہلا قدم اُس سے جمے گا جب جنتا اپنے راج چلانے والوں سے فوج اور پولیس رکھنے کی طاقت پھین لے گی اور دُنیا کے راج کا جی جیون سے ان محکموں ہی کو مٹا دے گی۔ جب تک حکومتوں کا دار مدار اور آدھار فوجوں اور پولیس پر ہے تب تک جنتا کو کوئی طاقت غلامی سے نہیں بچا سکتی۔ اس میں حکومت کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا جنتا کی بے پرواہی اور بے خبری کا۔ پُرانی شہنشاہیوں کا رُعب ابھی تک جنتا کے دلوں پر چھایا ہوا ہے۔ جنتا کی غلامی کی وہ ہوا جس میں یہ کہاوت بن گئی تھی — جنتا راجہ تھا پر جا — یعنی جیسا راجہ ہوگا دیسی ہی جنتا ہوگی، آج تک جنتا کے دل اور دماغ پر اپنا اثر جمائے ہوئے ہے۔ لوک راج کے زمانہ میں یہ ساری حالت جڑ سے بدلنی چاہئے۔

اب جنتا راج ہے۔ اب کہنا چاہئے دیتھا پر جاتھا راجہ، یعنی جیسی جنتا ہوگی ویسی ہی حکومت ہوگی۔ دُنیا میں کوئی بنا سوارتھ اور بے لاگ خدمت (سیوا) کے سیو یہ یعنی مخدوم نہیں بن سکتا۔ اگر جنتا یہ چاہتی ہے کہ وہ راج چلانے والوں کو اپنا سیوک اور خادم بنالے تو وہ اپنا یہ مقصد فوجوں، پولیس یا تلواروں سے حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ یہ فوجیں اور پولیس تو ایک بار ان کا سنگٹھن ہو جانے کے بعد حکومت کی ساری دولت اور طاقت کو اپنے ہی ہاتھوں میں لے لیں گے۔ اور پہلے راجاؤں کی جگہ یہ جنتا کے دوسرے راجہ بن بیٹھیں گے۔

جنتا کے اصلی راجہ بننے کا طریقہ سوائے اس کے جو باپوں نے بتایا ہے کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ طریقہ سوادلین اور اسہ یوگ کا طریقہ ہے۔ جنتا کا اسہ یوگ چاہے کسی دیشی حکومت سے ہو یا دیشی حکومت سے، اتنی زبردست شکتی ہے کہ جس سے کوئی حکومت ٹکڑ نہیں لے سکتی۔ پر اس اسہ یوگ کا رڈپ رچنا تک ہونا چاہئے، ہنساک تک نہیں۔ پولیس اور فوجوں سے مارکاٹ کی مگر لیکر یا کبول انھیں اپنے اسہ یوگ سے بھوکا مار کر ہم انھیں یا حکومت کو کوئی اصلی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اس سے تو ہم کو ہی بڑے سے بڑے پیمائے پر نقصان پہنچے گا۔ اسہ یوگ لکھا رچنا تک رڈپ سوادلین ہے یعنی یہ کہ اپنے علاقوں کا سنگٹھن اس طرح کر لیا جائے کہ وہ اپنے جھگڑوں کو آپ نپٹالیں اور اپنی رکھشا آپ کر سکیں۔ اگر ہم یہ سنگٹھن کر لیں تو کوئی حکومت نہ ہم پر پولیس راج قائم کر سکتی ہے اور نہ اس کی کوشش ہی کر سکتی

ہے۔ اگر ہمارے دیش میں امن امان بنائے رکھنے کی ذمہ داری جنتا اپنے ہاتھوں میں لے لے تو دیش میں اتنا بڑا سنگٹھن پیدا ہو جائے اور جنتا میں اسہ یوگ کرنے کی اتنی شکست ہو جائے اور اُس کے پاس اتنے سادھن جمع ہو جائیں کہ اُس کے بعد دُنیا کی کوئی حکومت اس پر فوجوں اور پولیس کی مدد سے اپنا راج نہیں جاسکتی۔ جہاں تک اپنی دیشی حکومت کا سمبندھ ہے وہاں تک اس پر اس سنگٹھن کا دیبا ہی اثر پڑے گا جیسا زہر کا دانت نکال لینے کا کالے ناگ پر پڑتا ہے۔ وہ پھر جنتا کا کچھ بگاڑ ہی نہ سکے گی۔

آج سے سو برس پہلے ہمارے گاؤں خود اپنی رکھشا کا پر بندھ کرتے تھے اور یہ پر بندھ اتنا اچھا اور پورا کرتے تھے کہ ہر اہل اس لیکھک نے اس کی تعریف کی ہے۔ سوائے کچھ بھیتا کی مرکزیت کے اور گاؤں کو اُجاڑ کر اُن کی جگہ بڑے بڑے شہر آباد کرنے کی طرف جھکاؤ کے اور کوئی کھٹائی اس سنگٹھن کو پھر سے قائم کر دینے میں ہمارے سامنے نہیں آ سکتی۔ بابو کہتے تھے کہ اگر حکومت میرے ہاتھ میں آجائے تو میں رہتا پولیس اور فوج کے اُسے چلانے کی ذمہ داری لے سکتا ہوں۔ اُن کے سامنے اس بات کو پورا کرنے کا یہی سیدھا سادا راستہ تھا۔

جنتا اگر اس راج کا جی پہلو کے علاوہ اس یوجنا کے سابی مالی اور روزگاری پہلوؤں پر دھیان دے تو اُسے اس یوجنا کے سمجھنے اور اُس سے اپنے اور دیش کے لا بھ کو جاننے میں اور بھی بڑی مدد مل سکتی ہے۔ دُنیا کی کوئی حکومت جنتا کے سمبندھ یوگ، اُس کے سنگٹھن اور اُس کی پوری پوری مدد

کے آج کل کے زمانے میں نہ امن قائم رکھ سکتی ہے اور نہ انیاء اور ڈرا چاروں کے طوفانوں کو بڑھنے سے روک سکتی ہے ۔ ہماری حکومت کے نیتاؤں سے بڑھ کر نیک نیت آدمی دوسری حکومتوں میں ملنا کٹھن ہے ۔ یہ لوگ نیک نیتی کے ساتھ اپنی ساری طاقت رشوت کو روکنے میں لگا رہے ہیں پر رشوت روکنے کی جگہ دن دن شیطان کی آنت کی طرح بڑھتی ہی جا رہی ہے ۔ اگر جنتا اپنے آپ سنگٹھن کر کے اس طوفان کو نہیں روکتی تو دنیا کی کوئی شکست اسے نہیں روک سکتی ۔ اسی طرح سامپرواکینا کے طوفان کو روکنے میں ان نیتاؤں نے اپنی ساری شکست لگا دی تھی بھر بھی اسکی بارڈ بڑھتی ہی جاتی تھی ۔ اگر بالو اپنی جان دے کر اسے ٹھنڈا نہ کرتے تو حکومت اکانگریس ، دیش بسپی اس کی بارڈ میں بہہ کر ختم ہو گئے ہوتے ۔ دیش کے سداچار کو ٹھیک کرنا اور امن قائم رکھنا بلوری طرح جنتا کے ہاتھ کی چیزیں ہیں ۔ جنتا کے سولے نہ کوئی اس ذمہ داری کو لے سکتا ہے اور نہ کامیابی کے ساتھ نباہ سکتا ہے ۔ جنتا اگر ان کاموں کی ضرورت کو سمجھ لے اور انھیں کامیاب بنانے میں لگ جاوے تو صدیوں میں نہیں برسوں اور مہینوں میں اسے امن چاہی کامیابی مل سکتی ہے ۔ یہ کامیابی اور باتوں کے ساتھ ساتھ اسے راج کاتی پارٹیوں کی کھینچا تانی اور اس سے پیدا ہونے والی بربادی سے ہمیشہ کے لئے بچائے گی ۔

اگر جنتا اپنی رکھشا کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لے لے تو ایک طرف تو یہ اپنے اپنے علاقے کے نا سمجھ اور بھکے ہوئے لوگوں پر قابو حاصل کر لے گی اور دوسری طرف اس میں اتنی

شکنتی پیدا ہو جائے گی کہ راج کا جی پارٹیاں اور فرقہ دارانہ گردہ پھر اُسے یاد دیش کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔
 سنگر سیوا اور سوادھن دونوں باپو کے رام یان ہیں۔ اُنکا استعمال سیکھ کر کوئی جنتا کمزور اور بے بس رہ ہی نہیں سکتی۔
 ہم نے جو کچھ اوپر دیا ہے وہ باپو کے ددھان کا ایک عام ڈھانچہ ہے۔ پارلیمنٹی راج کو سدھارنے اور اُن پر قابو پانے کے جو طریقے باپو نے اس ددھان میں دیئے ہیں اُن پر ہم اگلے صفحے میں لکھیں گے۔

برابر کی گورنمنٹ

باپو کے ددھان کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ہمیں اس بات کو نہیں بھٹلانا چاہئے کہ وہ جنتا کو دیش کا اصلی راجہ اور حکومت کو جنتا کا سچا سیلوک بنانا چاہتے تھے۔ ہمارے مسلح میں جب تک یہ انقلاب اصلی معنی میں پیدا نہیں ہوتا تب تک سچا لوک راج یا انسانی بھائی چارہ قائم نہیں ہو سکتا۔
 پر جنتا کے اصلی راجہ ہونے کے معنی کیا ہیں اور وہ کس طرح اصلی راجہ بن سکتی ہے؟

سنار کے اتہاس میں یہودی قوم کا یہ دعویٰ تھا کہ اُن کی کتاب قریت میں خدا نے انھیں دنیا میں ایک حکومت دینے کا وعدہ

کیا ہے۔ اتہاس کے شروع سے وہ اس حکومت کو ڈھونڈھنے کی
 دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ اس لئے یہودیوں کو 'اتہاس کے باغی،
 (the rebels of history) کہا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے تورت
 کی اس بھوشیہ بانی کو دوسری طرح سمجھایا۔ انھوں نے بتایا کہ خدا
 کسی سے اس دُنیا کی حکومت کا وعدہ نہیں کرتا، وہ لوگوں کو
 بد لوگ یعنی بہشت کی حکومت حاصل کرنے کی دعوت دیتا
 ہے، اور وہی اصلی اور سچی حکومت ہے۔ یہودیوں پر اس کا
 کچھ اثر نہ ہوا۔ یہودی آج بھی وہی اپنی پرانی حکومت
 فلسطین میں جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُن کا شروع سے یہ
 بھی خیال ہے کہ جو نشان اور حوالے اس حکومت کے انھیں دیئے گئے
 ہیں وہ فلسطین میں اور اُس کے آس پاس بہت کچھ ملتے ہیں۔ جہاننگ
 عیسائیوں کا سمبندہ ہے انھوں نے حضرت عیسیٰ کی اس بات کو تو مان
 لیا کہ سچی حکومت بہشت کی ہی حکومت ہے۔ پر انھوں نے اس میں
 یہ اور جوڑا کہ بہشت کی حکومت حاصل کرنے کے لئے دُنیا کی حکومت
 کا بھی چرچ یعنی عیسائی یادریوں کے ہاتھوں میں ہونا ضروری ہے۔
 اس کے لئے انھوں نے اپنے راجاؤں کی گورنمنٹ کے برابر برابر
 اپنی ایک الگ پیریل گورنمنٹ کھڑی کرنے کی کوشش کی۔ اس پر
 راجاؤں سے ان کی ٹکڑ ہوئی۔ راجاؤں نے انھیں ہرا دیا اور اسکے
 ساتھ ہی ساتھ اپنی دُنیا کی حکومت کو مذہب اور سدا چارنگ سے
 پوری طرح آزاد کر لیا۔ اس طرح یورپ میں لادھہی اور بے دینی کا
 وہ دور شروع ہوا جس نے تھوڑے ہی دنوں میں ساری دُنیا پر اپنا
 اثر ڈال دیا۔ باپو اسی بے دینی کو اس دُنیا سے مٹانا چاہتے تھے اور

اس کی جگہ پر لوک میں نہیں اسی دُنیا میں وہ نیتک راج قائم کرنا چاہتے ہیں جس کا روپ وہی ہوگا جو حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰؑ بھگوت گیتا، محمدؐ صاحب اور دُنیا کے ہر بڑے دھرم نے بتایا ہے۔ یعنی سچا لوک راج اور انسانی بھائی چارا۔

ناگپور میں کانگریس کے لئے باپو نے ایک نیا ددھان بنوایا تھا۔ دیش بندھو چترنجن داس نے اُس سے باپو کے ددھان کو دیکھ کر کہا تھا کہ اس میں باپو نے انگریزی راج کے برابر ایک پیریل راج قائم کرنے کی داغ بیل ڈالی ہے۔ یہ رائے ایک مدت تک ٹھیک تھی۔ پر کانگریس باپو کا یا اُس ددھان کا اصلی مطلب نہ سمجھی۔ کانگریس نے ایک ایسا نیتک سنگٹھن کھڑا کرنے کے بجائے، جو حکومت سے اونچا اور اس کے اوپر ہو اور جو فوج یا پولیس کی طاقت پر نہیں بلکہ سنوارتھ سیوا اور سدا چار پر قائم ہو، انگریزوں سے راج چھین لینے کو ہی اپنا مقصد بنالیا۔

کانگریس نے یہ مقصد حاصل تو کر لیا پر کانگریس کے راج بن جانے سے وہی خونی اور گھاتک نتیجے پیدا ہوئے جن کا پیرا ہونا اُس نیتک سنگٹھن کے نہ بن سکنے کے کارن سوا بھادک تھا۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ باپو ہمیشہ کانگریس کو حکومت سے باہر رکھنے اور اپنے آپ کو اور ملک کو ان بُرے نتیجوں سے بچنے کی صلاح دیتے رہے۔ اس ددھان میں انھوں نے آخری بار کانگریس کو حکومت سے باہر آنے اور اس حکومت سے اوپر اور اُس کے برابر برابر ایک ایسا پیریل راج قائم کرنے کی صلاح دی ہے جو جنتا کا سچا سیوک اور رکھشک ہو اور جو دیش کی

حکومت کو بھی جتنا کا سچا سیوک بنا سکے۔ حکومت کے لئے اس صلاح کا ماننا آسان نہیں ہے۔ پر جتنا اس ودھان کو اس طرح بھول نہیں سکتی۔ جتنا کے لئے سچ سچ راجہ بننے کا اور کوئی دوسرا راستہ ہے بھی نہیں، سوائے اس کے کہ وہ اپنے راج کا ج کی دیکھ رکھ اور نگرانی کے لئے اس ودھان کے انوسار ایک نیتک سنگٹھن کھڑا کر لے۔

باپو نے اپنے اس ودھان میں اسی طرح کا ایک پیریل راج قائم کرنے کی داغ بیل ڈالی ہے، جو پارلیمنٹی راج کی بُرائیوں سے پاک ہو اور جو دیش کی حکومت کو ان بُرائیوں سے بچا سکے۔ ہم دکھا چکے ہیں کہ باپو نے اپنے اس سنگٹھن کو حد درجے کا غیر مرکزی رکھا ہے اور ہمارے پُرانے اتھاس کے آدھار پر ہر گاؤں کو ایک پوری اور آزاد ری پبلک کی صورت دی ہے۔ اگر اس طرح کی ایک بھی ری پبلک قائم ہو جاوے تو دوسری قائم ہونے میں دیر نہیں لگ سکتی۔ کھٹائیاں جو کچھ پڑیں گی شروع ہی میں پڑ سکتی ہیں۔ اس سنگٹھن کی باپو نے جو سب سے چھوٹی بنیادی اکائی اپنے ودھان میں رکھی ہے وہ ہم انھیں کے شبدوں میں نیچے دیتے ہیں—

”پانچ ایسے بالغ مردوں یا عورتوں کی ہر پنچائٹ جو یا تو گاؤں کے رہنے والے ہوں یا جن کے من میں گاؤں کی لگن ہو، اس سنگھ کی اکائی ہوگی۔“

باپو کے اس اکائی پر نگاہ ڈالتے ہی ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ اکائی پارلیمنٹی راج کی ان سب بُرائیوں سے پاک ہے

جنہوں نے اُس راج کو اتنا خطرناک بنا رکھا ہے۔ چُنّاؤ کی ان میں کوئی چھایا نہیں۔ قانونی نمائندگی کا ان میں کہیں پتہ نہیں۔ انھیں کوئی حق یا سادھن حکومت کی طرف سے نہیں ملے۔ سرکاری پنچائتوں کی طرح یہ کسی سرکاری قانون کی پابند نہیں۔ راج کا جی منگاہ سے انھیں پوری آزادی حاصل ہے۔

اگر ہم انھیں پُرانی پنچائتوں سے ملا کر دیکھیں تو یہ اُن سے بھی اونچی اور اچھی ہیں۔ پُرانے پنچوں کو نمائندگی کا ادھیکار چُنّاؤ سے ملتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُن کا چُنّاؤ اور اُن کی نمائندگی دونوں آج کل کے مقابلے میں سچے اور اصلی لوگ راج کے اصولوں پر تھے۔ پھر بھی اُن کو ادھیکار چُنّاؤ سے ہی ملتا تھا اس لئے وہ پنچائتیں سوادہی نہیں تھیں۔ پُرانی پنچائتوں کی یہی بنیادی کمی تھی۔ وہ اپنے اندر کی نیتک شکست سے پیدا نہیں ہوئی تھیں اسی لئے اُن میں باہر کی شکستوں سے اپنے آپ کو بچا رکھنے کی طاقت پیدا نہیں ہو سکی۔ دیش کے راجہ اور بادشاہ ان پنچائتوں کے ادھیکاروں میں تو دخل نہ دیتے تھے، پر وہ راجہ جن کے دل میں دیش کے ریت رواجوں کی بہت ادھاک قدر نہیں تھی گاؤں کے دوسرے راج کا جی معاملوں میں دخل دے سکتے تھے اور کبھی کبھی دیتے بھی رہتے تھے۔ پر چونکہ دیش کی بھیتا اور نیتک ہوا ان پنچائتوں کی مددگار تھی اس لئے وہ ہزاروں سال تک اپنا کام اچھی طرح چلاتی رہیں۔ اب وہ حالت بدل گئی۔ اب جب تک کوئی سنگٹھن ایسا کھڑا نہ ہو جائے جو ہمارے دیش کے سدا چار کو غیر سدا چاری حملوں سے بچا سکے تب تک ہماری بھیتا اس ملک میں قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لئے ایک

نئے نیک سنگٹھن کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ باپ کی پنچائتیں اسی سنگٹھن کا بیج ہیں۔ وہ پرانی پنچائتوں کی جگہ لینے نہیں آئی ہیں۔ ان پنچائتوں کے بیچ خود ہمیشہ گاؤں کے چٹاؤ اور راج کا جی دائروں سے الگ رہیں گے۔ حکومت اور طاقت چٹاؤ اور نمائندگی اپنے ساتھ جو شکست اور سادھن لاتے ہیں ان میں ان پنچوں کا کبھی کوئی حصہ نہ ہوگا۔ ان کے تیاگ، ان کی نیک نیتی اور ان کی بنوار تھ سیوا کا جنتا کے لئے یہی کھلا ثبوت ہوگا۔ اسی پر ان کے اثر اور طاقت کی بنیاد ہوگی۔ ان کی سیوا، ان کا ساہس، ان کی نیک نیتی، ان کا سدا چار اور ان کا جنتا کے شکہ دکھ میں ساتھ دینا، اور جنتا کو باہر کے دباؤ سے بچانے کی دل جان سے کوشش کرنا، یہ سب چیزیں ان کی اس تشکیلی کو بڑھاتی رہیں گی۔ اس طرح آج کل کی سرکاری پنچائتوں سے باہر رہتے ہوئے یہ انھیں سوادہبی بنانے اور پوری آزادی حاصل کرنے کی طرف بڑھاتے رہیں گے۔ گاؤں میں ان کی وہی جگہ ہوگی جو سارے لوگ سیوک سنگٹھن کی دیش میں ہوگی۔

کہا جاسکتا ہے کہ آج کل کی دنیا میں کوئی نگاؤں یا گاؤں کی پنچائت سوادہبی کیسے ہو سکتی ہے یا کوئی بھی حکومت اپنے آپ کو باہر کی مالی، سماجی راج کا جی اور نیک زندگی سے بالکل ناتا توڑ کر سوادہبی کیسے بن سکتی ہے۔ یہ اعتراض سوادہبی کے معنی ٹھیک ٹھیک نہ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ آج کل کی چاروں طرف پھیلی ہوئی اس کھینچا تانی سے اپنے آپ کو الگ رکھنا جس میں ہر ایک دوسرے کو اپنا دشمن مانتا ہے، دوسروں سے ناتا توڑنا نہیں ہے، ناتا جوڑنا ہے۔ اپنی ساری ضرورتیں خود اپنی محنت سے پوری کرنے

کی حد درجہ کی کوشش کرنا دوسروں سے ناتا توڑنا نہیں ہے بلکہ اسی مقصد کی طرف بڑھنا ہے جس کی طرف دُنیا بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اُن چیزوں سے بچنا جو ہمیں نقصان پہنچاتی ہیں، ہر آدمی اور ہر گروہ کا فرض ہے۔ ایسی چیزوں سے اپنا کام چلا لینا، جو ہمیں اپنے یہاں مل سکتی ہیں اور جو ہماری دولت کو باہر جانے سے روک کر ہمارے پیٹ بھرنے اور تن ڈھکنے میں مدد دیتی ہیں، کسی سے ناتا توڑنا نہیں بلکہ دشمنی، نفرت، دنگوں اور جنگوں سے بچنے اور دوسروں کو بچانے کا راستہ نکالنا ہے۔ اسی سے ہم میں وہ نمسکتی پیدا ہو سکتی ہے جس سے ہم اپنی اور دوسروں کی سچی رکشا اور سیوا کر سکیں۔ ایک دوسرے سے بیجا فائدہ اٹھانے کی رچھا اور کوشش جو آج ہم سب کی عام زندگی ہے، دوسروں سے ناتا جوڑنی نہیں توڑتی ہے۔ اس رچھا اور اس کوشش کو اپنے اندر سے مٹا دینے کے بعد ہی ہم ایک دوسرے سے سچا اور صحیح ناتا جوڑ سکیں گے۔

دوسروں سے بیجا فائدہ نہ اٹھانا اور دوسروں کو ہر جائز فائدہ پہنچانے کی کوشش کرنا یہی سواولین کے بُنیادی اصول ہیں۔ اس میں الگ رہتے یا ناتا جوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ حد درجہ کا سہیوگ ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ اس سہیوگ کو سدا چاری اور انسانی بُنیادوں تک ہی رکھنا چاہتا ہے، اور یہ بات کیوں اپنے بچاؤ کے لئے نہیں بلکہ دُنیا کے سب انسانوں کی بھلائی اور بہتری کے لئے۔

باپو کے اس ودھان اور اُن پنچائتوں میں اپنے کو کچھ چیزوں سے الگ رکھنے کی بات بھی ہے۔ یہ الگ رکھنا کن چیزوں سے ہے؟

آج کل کے جیون کو ان پہلوؤں سے جو ہماری ساری انسانی زندگی کو مٹیا بیٹ کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے پر حکومت کرنے سے، دُرا چاروں بے ایمانیوں اور ظلموں سے، جنتا کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے سے، پھوت اچھوت اور سامپر دایک زہر سے۔ یہ پنچائتیں تو سب انسانوں کو ایک گنبد کے رُپ میں لانا چاہتی ہیں، دُنیا کو ایک برادری بنانا چاہتی ہیں، اور آدمی آدمی میں گتے بھائیوں کا سامبندھ اور ویہار قائم کرنا چاہتی ہیں۔ ان میں دوسروں سے الگ رہنے اور ناتا توڑنے کی بات آہی نہیں سکتی۔ دُنیا کی حالت اتنی بگڑ گئی ہے کہ اس میں سچے بھائی چارے اور برابری کا دچار ناتا توڑنا معلوم ہوتا ہے۔ لوگوں کی ناالغافیوں، پارٹی بازیوں اور طرح طرح کی بُرائیوں میں حصہ لینا ناتا جوڑنا معلوم ہوتا ہے، اور مترتا کا آدرش مانا جاتا ہے۔ جو پارٹیاں دیش کی جنتا کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہیں، جو دھرم مذہب جنتا کو الگ الگ ٹکڑوں میں رکھنے کے لئے لوہے کی دیوار بن گئے ہیں۔ جو دیش ایک دوسرے کو مارنے اور روٹنے کے لئے ڈاکو بنے ہوئے ہیں، اور جن کی بھیتا اپنے فائدے کے لئے دوسرے کو نقصان پہنچانا جائز بتاتی ہے، ان سب سے دور رہنے کی کوشش کرنا ہمیں دنیا سے ناتا توڑنا دکھائی دیتا ہے۔ بالو کا ودھان نسوارتھ سیوا اور مالو پریم کو جیون کا بُنیادی اصول بنا کر کسی سے ناتا توڑنا نہیں، بلکہ سب کو ملانے کا سب سے اچھا طریقہ ہے۔ بالو کی پنچائتیں دُنیا سے الگ نہیں رہیں گی۔ اُنکے ودھان ہی میں ان کے بڑھنے اور ایک دوسرے سے مل کر کام کرنے کا نقشہ دیا ہوا ہے۔ ہم اُسے اُنھیں کے شبدوں میں نیچے

دیتے ہیں۔

”اس طرح کی دو پاس پاس کی پنچائتوں کو ٹاکر ایک کام کرنے والا جتھا بنے گا جو اپنے میں سے ہی ایک کو اپنا نیتا چن کر اُس کے ادھین کام کرے گا۔

جب اس طرح کی سو پنچائتیں بن جائیں گی تو اُن کے بیچ پاس پہلے درجے کے نیتا اپنے میں سے ایک دوسرے درجے کا نیتا چنیں گے، اسی طرح برابر ہوتا رہے گا۔ اس بیچ پہلے درجے کے نیتا دوسرے درجے کے نیتا کے ادھین کام کریں گے۔ دودسویں پنچائتوں کے اسی طرح برابر برابر کے گروہ بنتے رہیں گے جب تک کہ یہ پنچائتیں سارے ہندستان میں نہ پھیل جائیں۔ ان پنچائتوں کا بعد کا ہر گروہ پہلے گروہ کی طرح اپنا دوسرے درجے کا نیتا چنے گا۔ دوسرے درجے کے سب نیتا مل کر سارے ہندستان کی سیوا کریں گے اور اگلے اپنے علاقوں کی سیوا کریں گے۔ دوسرے درجے کے نیتا جب کبھی مزدوری سمجھیں اپنے میں سے ایک کو سردار چن سکیں گے۔ وہ سردار جب تک چاہے گا اُن سب گروہوں کی قاعدے داری کرے گا اور انھیں اپنے حکم میں رکھے گا۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ پنچائتیں دوسروں سے ناتا توڑنے کے اصول پر قائم نہیں کی گئیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنے ہی نہیں سارے ہندستان بلکہ دُنیا کے بھلے کو سامنے رکھ کر کام کرنا ہوگا ساتھ ہی یہ پنچائتیں ایک انقلابی پیغام لے کر دُنیا کے سامنے آئی ہیں اس لئے اُن کے دشمن کی بنیاد اس طرح پر پڑنی مزدوری ہے کہ وہ دُنیا کی آپس کی دشمنیوں، لاگ ڈانٹ کھینچا تانی اور گھاتک چالوں

سے اپنے آپ کو اور اپنے حلاقوں کو بچا کر رکھ سکیں۔
 اوپر کی دھاؤں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باپو نے جو پہلو
 چُناؤ کا ان میں رکھا ہے وہ آج کل کے چُناؤ سے بالکل دوسرے
 ڈھنگ کا ہے۔ جو مرکزیت باپو نے ان میں رکھی ہے اُسے چُناؤ ہوتے
 ہوئے بھی ڈکٹیٹری کی شکل دی ہے۔ اس ددھان میں اس سے زیادہ
 ان پُچائٹوں، ان کے گرد ہوں اور نیتاؤں کے آپسی سمبندھ کی بابت
 کوئی اور نیم یا قاعدے نہیں دیئے گئے۔ یہ تینوں باتیں پارلمینٹری راج
 کے چالو طریقوں سے بالکل الگ ہیں۔

جہاں تک ان پُچائٹوں کا سوال ہے باپو نے ہر طرح کی چُناؤ
 کی بُرائیوں سے انہیں بچایا ہے۔ چُناؤ کا جو پہلو انہوں نے اپنایا
 میں لے لیا ہے اس میں سے بھی اُس کے زہر کو نکال دینے کی ایک
 عجیب صورت نکالی ہے۔ ددھان کہتا ہے کہ پہلے درجے کے نیتا اپنے
 میں سے ایک دوسرے درجے کا نیتا چُنیں گے اور اُسے اپنا لمیڈر
 مان کر اُسی کے نیچے کام کریں گے۔ باپو نے اس نئے طریقے میں آجکل
 کے چُناؤ کا سارا رُوپ اور ڈھنگ بدل دیا ہے۔

باپو اس دُنیا میں ایک زبردست نیتک کیا کر (Morl -
 Chemist) - تھے۔ عام طور پر چُناؤ میں لوگوں کے دلوں کے
 بُرے سے بُرے بھاؤ، نفرت، غصہ، تکروم، بے ایمانی سب اُدھر
 آجاتے ہیں۔ باپو کے اس چُناؤ میں یہ ساری صورت بدل گئی۔ اس
 سے پہلے درجے کے نیتاؤں میں تیاگ اور اُدارتا پیدا ہوگی اور دوسرے
 درجے کے نیتاؤں میں خمرتا، احسان مندی، اور دفا داری پیدا ہوگی۔
 اور دلوں ہی میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور محبت پیدا ہوگی۔

ایک دوسرے کی عزت ہوگی۔ اگر باپ کا بتایا ہوا یہ ڈھنگ عام ہو جائے تو چٹاؤ کی ادھک تر بُرائیاں دُور ہو سکتی ہیں۔ پڑانے اور پہلے درجے کے نیتاؤں اور نئے یا دوسرے درجوں کے نیتاؤں میں جو کھینچنی پانی ہوتی ہے وہ ہمارے راج کاجی جیون کا سب سے بھدا اور دردناک پہلو ہے۔ باپ نے اپنے نئے ودھان میں اسے ختم کر دیا ہے۔ باپو یہ نہیں مانتے تھے کہ اگر ذمہ دار عہدوں پر اول درجے کے نیتا ہونگے تبھی ان عہدوں کا کام اچھی طرح چل سکے گا۔ حکومت کے اور ذمہ داری کے کام دوسرے درجے کے نیتاؤں سے لینا اور پہلے درجے کے نیتاؤں کا خود پیچھے رہ کر جتنا کی سیوا کرنا ایک نیا اور بہت ہی اچھا پروگ ہے۔ یہی سچی غیر مرکزیت ہے۔ اسی سے سچا لوک راج پیدا ہو سکتا ہے۔ ہم اگر باپو کے اس اصول کو سمجھ لیں اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں تو دنیا کے راج کاجی جیون کی آدھی سے زیادہ گندگی مٹ جائے۔

اس ودھان میں دوسری بات جس کی طرف ہمیں دھیان دینا ہے وہ ان پچاٹھوں کا دیش کی مرکزی سرکار کے ساتھ سمبندھ ہے۔ ان میں پارلیمنٹی راج کی کوئی جھلک نہیں ہے۔ اگر کوئی جھلک ہے تو ڈکٹیٹری کی۔ یہاں بھی باپ نے دوسرے درجے کے نیتا کو پہلے درجے کے نیتاؤں کا ڈکٹیٹر بنا کر ڈکٹیٹری کے زہر کو نکال دیا۔ وہ ڈکٹیٹر بھی جبری نہیں چٹنا ہوا ہوگا۔ ڈکٹیٹری یا ڈکٹیٹر شپ اسے کہتے ہیں کہ ایک آدمی جو کسی راج یا مستحقا کا سردار ہو یا کسی دوسرے کی رائے کے پرواہ کے سارا کام اپنی اکیلی رائے سے چلا سکے۔ عام طور پر ڈکٹیٹر یا ڈکٹیٹری کے نام سے ہمیں اتنی نفرت

ہے اور اپنے آج کل کے راج کے ڈھنگ پر ہم اتنے لٹو ہیں کہ ہمیں ان دونوں طریقوں کی الگ الگ بھلائی بُرائی دکھائی بھی نہیں دیتی۔

سچ یہ ہے کہ پارلیمنٹی راج میں قانون بنانے کے ڈھنگ اتنے بُرے اور اتنے خطرناک ہیں کہ قانون بنانے کا اس سے زیادہ بُرا ڈھنگ سوچا ہی نہیں جاسکتا۔ ان کے بنائے ہوئے آج کل کے ادھک تر قانون نکتے، نقصان پہنچانے والے اور غیر ضروری ہوتے ہیں۔ ہمارے اس لوک راج کے دور میں قانون ایسے اور اتنے ہونے چاہئیں کہ جنہیں سب آسانی سے سمجھ سکیں اور یاد رکھ سکیں۔ آج کل پارلیمنٹی طریقے کی بدولت اتنے اور ایسے قانون بنتے ہیں کہ جن سب کو جاننا تو الگ رہا ان کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بڑے سے بڑے دکیلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس پر بھی ایک ایک قانون اور ایک ایک دفعہ کے طرح طرح کے اور ایک دوسرے کے خلاف معنی کئے جاتے ہیں اور ہر معنی کے لئے بے انت تخمینے ہوتی ہیں۔ اس پر اندھیرہ کہ ہر پھوٹے سے پھوٹے آدمی کے لئے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ وہ ان سب قانونوں کو جانے۔ کوئی غلطی کرنے والا کسی کچھری یا دربار میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اس قانون یا دفعہ کو نہ جانتا تھا۔ معلوم نہیں دُنیا کو قانونوں کی ضرورت یا قانونوں کی بھوک کتنی بڑھ گئی ہے کہ ہماری قانون بنانے والی دھارا سمجھاؤں کو قانون بنانے سے کبھی فرصت ہی نہیں ملتی۔ جتنا کہ کروڑوں اور اربوں روپے ان دھارا سمجھاؤں اور ان کی عمارتوں پر خرچ ہوتے رہتے ہیں۔ دُنیا کے کسی شہنشاہ کے دربار پر بھی شاید اتنا خرچ نہ ہوتا ہوگا۔ پرانی دُنیا میں دو چار کتابیں کروڑوں آدمیوں کی ضرورتوں کے لئے کافی ہوتی تھیں۔

اب بڑے سے بڑے کتاب گھر بھی کافی نہیں ہوتے۔ کروڑوں روپے پانی کی طرح بہائے جاتے ہیں۔ اس ساری فضول خرچی اور اتنے بڑے بڑے لوگوں کے اپنی جان کھپانے اور اپنے دماغ لڑانے کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی مقدمہ ایسا نہیں ہوتا جس میں بڑے سے بڑے جھوٹ اور فریب کسی نہ کسی پیانے پر نہ برتے جاتے ہوں۔ جس کسی آدمی کا قانون سے کچھ بھی سمبندہ رہا ہے وہ جانتا ہے کہ شاید ہی کوئی مقدمہ بنا جھوٹ کے چلایا جاسکتا ہو یا کامیاب ہو سکتا ہو۔ ہمارے انکھے لوگ راج کی اس سنسٹھا نے جتنا کو جان بوجھ کر جھوٹ بولنے پر جتنا مجبور کیا ہے اسنا شاید ہی کسی دوسری بات نے کیا ہو۔ پھر بھی قانون گڑھنے کی ان نئی ٹکسلاؤں کو ہم کبھی سمجھتا کاسب سے چلتا ہوا اور بڑھیا کا رنامہ سمجھتے ہیں۔ اس سے زیادہ بد نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے۔

قانون سازی کے ان محلوں کی ایک دشینستاریہ بھی ہے کہ ان کے ممبر جن شرطوں پر چنے جاتے ہیں ان میں اس طرح کی کوئی شرط نہیں ہے کہ جو لوگ چنے جاویں انھیں قانون بنانے کی جان کاری بھی ہو۔ قانون بنانا ان کا پیدائشی حق مان لیا گیا ہے۔ یہ کہنا کہ لوگ راج اور انسانی برابری کے زمانے میں قانون بنانے کا حق سب کو ایک برابر حاصل ہے اور اس طرح کا بھید بھاؤ لوگ راج اور بان متا دھیکار کے اصول کے خلاف ہے ایک بے بنیاد بات ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس طرح کی سب انوکھی اور ان ہونی باتیں کبھی سمجھتا اور مرکزیت کی ہی پیداوار ہیں۔ ہم نے انھیں بنا ان کی اصلیت اور نتیجوں پر دھیان دیئے راج کالج کے بہاؤ میں پروکر تقال کی طرح نقل کر لیا ہے۔ جہاں تک حق کا سوال ہے دنیا میں ہر آدمی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بڑھئی بن سکے یا بھنگلی

ہن سکے پر جو آدمی بھی اس حق کو کام میں لانا چاہے گا اُسے پہلے بڑھئی یا بجٹی کا کام سیکھنا ہوگا، تبھی وہ کسی بڑھئی خانے میں یا میونسپلٹی کے صفائی کے محکمے میں بھرتی کیا جاسکے گا۔ کیوں کسی بات کا حق ہونا جب تک ہم میں وہ حق ادا کرنے کی یوگیتا نہ ہو ہیں اس کام کے لئے تنخواہ پانے اور طرح طرح کے خرچے اور پیچھے لینے کا حق دار نہیں بنا دیتا، کچھی سمجھنا حقوں اور ادھیکاروں کا دور اپنے ساتھ لائی ہے۔ ہر حق کے مقابلے کے کوئی فرض بھی ہوتے ہیں، یہ سوال ہی اس دور میں نہیں پیدا ہوتا ہم سمجھتے یہ ہیں کہ ہم سب جتنا کے نمائندے ہیں اور اس حیثیت سے ملک کے بادشاہ بھی ہیں۔ انگلستان کے قانون کے انوسار بادشاہ کے حق ہی حق ہوتے ہیں، اس کا کوئی فرض نہیں ہوتا۔ پھر اگر وہاں کے اس رواج کا سایہ ہم پر بھی پڑ رہا ہے تو اس میں اچھٹ کیا ہے۔

باپو کے ودھان میں مرکزیت کیوں کاری پہلو (Executive) تک ہی رکھی گئی ہے۔ راج کالج سے اگر قانون بنانے کا حق لے لیا جاوے تو عملی کار بار کے لئے ڈکٹیٹری سب سے اچھا طریقہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہمیں ڈکٹیٹری کو نیتک بندھنوں میں جکڑ دینا ہوگا۔ جیسے باپو نے اپنے ودھان میں جکڑا ہے۔ جہاں تک ودھان کی مرکزیت کا سمبندھ ہے وہاں تک باپو نے اس ودھان میں اس کے لئے کوئی قاعدے یا قانون نہیں رکھے۔ ایسا کرنے سے ان کا بڑھنا اور پھیلنا رُک جاتا۔ باپو نے انھیں بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی پوری سودھادی ہے اور اپنی سنے سنے کی ضرورتوں اور آؤ بھوں کے انوسار اپنے روپ کو بدلنے اور سدھارنے کی انھیں آزادی دی ہے۔ انھوں نے ان پنجاٹوں کو اور ان کے گرد ہوں کو مرکزی حکومت سے اپنے سمبندھ کو بھی ضرورت

کے اؤسار طے کرنے اور بدلتے رہنے کے لئے آزاد چھوڑا ہے۔ یہ بات بھی ضروری تھی۔ سچے لوگ راج کی ضرورتوں کو آجکل کے طریقے اور سنتھیں پورا نہیں کر سکتیں۔ ہمیں آج کل کی ان سب سنتھاؤں اور قاعدے قانونوں کو نینک بنیادوں پر پھر سے نئے نئے ردیوں میں تعمیر کرنا ہوگا۔

ادھر ہم نے باپو کے ددھان کے کچھ پہلو یہ دکھانے کے لئے دیئے ہیں کہ باپو کی نگاہ ہر چیز پر کتنی رچا تک اور مدھار کی ہوتی تھی۔ اب ہم ان کے ددھان کے اس حصے کی طرف دھیان دلاتے ہیں جو سیدھے راج کالج سے سمبندھ رکھتا ہے۔

اس میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ ان پچائٹوں کا باہری دنیا سے کیا سمبندھ ہوگا یا یہ کہ ان میں مرکزیت کس روپ میں اور کس پیمانے پر ہوگی۔ مرکزیت خود کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ کیوں اس سے سوال مبن کے اصول میں کمی نہیں آتی چاہیے۔ سوال مبن کی اصلی صورت یہ ہے کہ ایک طرف تو ہمارا جیون دوسرے کسی کو بے جا نقصان نہ پہنچا سکے اور دوسری طرف جو باتیں ہمیں نینک یا آرتھک نقصان پہنچاتی ہیں ان سب سے اپنے کو بچا کر رکھا جاوے۔ اسی بنیادی سچائی پر ان پچائٹوں کے سارے باہر کے سمبندھ قائم ہوں گے۔ جہاں تک ان پچائٹوں کے آپس کے سمبندھ کا سوال ہے سو پچائٹوں کے پچاس پہلے درجے کے نیتال کر اپنا سب کا ایک نیتا اور پھر اسی طرح کے دوسرے درجے کے نیتال کر اگر چاہیں تو اپنا سب کام ایک نیتا یا سردار چُن سکتے ہیں اور اسی کے ادھین اپنا سارا کام کر سکتے ہیں۔ اس طرح اگر ایک ضلع میں دو ہزار گاؤں ہوں اور ہر گاؤں میں ایک پچائٹ

ہو تو کل ضلع میں بیس دوسرے درجے کے نیتا ہوں گے یہی مل کر ضلع کی کارکن کمیٹی کا روپ لے لیں گے اور چاہیں گے تو اپنے میں سے ایک کو اپنا سردار یا نگھیا چن لیں گے۔ یہ کمیٹی سوا دلہن کے اصول پر اپنی ماتحت پنچائتوں کی سیوا کرے گی یعنی ان کے اس طرح کے مال کے لانے لے جانے، خریدنے بیچنے اور اڈل بدل کرنے میں انھیں مدد دے گی جو ایک جگہ کے لئے ضروری اور دوسرے کی ضرورت سے زیادہ ہو۔ یہ اڈل بدل اس اصول پر ہوگا کہ اس میں کسی کو بھی بے فائدہ یا بیجا نقصان نہ پہنچے۔ اس کمیٹی کے اور سب فیصلے بھی برابری اور بھائی چارے کے اصول پر ہوں گے، لاگ ڈاٹ، یا کسی کے نجی فائدے کے آدھار پر نہیں۔ اسی طرح ہر صوبے کی پنچائتیں اگر چاہیں گی تو سارے ہندستان کے لئے اپنی مرکزی کمیٹی بنالیں گی۔ یہ سارا سنگٹھن بہت ہی سیدھا اور سرل ہوگا۔ اگر اس کے چلنے میں کوئی کٹھنائی ہوگی تو تجربے کی روشنی میں ان کے حل نکال لئے جا دیں گے۔ ان پنچائتوں کے پاس کوئی قانونی حق یا راج کی دی ہوئی کوئی ددلت یا طاقت نہیں ہوگی۔ ان کا جو کچھ بھی اثر لوگوں پر ہوگا وہ کیول ان کی رسوا تھ سیوا کے کارن ہوگا۔ جب انھیں کوئی ادھیکار یا پد راج کا جی چنناؤ سے یا راج کی طرف سے یا کوئی اس طرح کی نوکری نہیں ملے گی تو ان میں آپس میں کوئی لاگ ڈاٹ، بیر یا کھینچا تائی بھی آج کی طرح پیدا نہ ہو سکے گی۔

جہاں تک ان پنچائتوں کا سمبندہ آج کل کے مرکزی راج سے ہے ان کی سدا یہ کوشش رہے گی اور اس کے لئے وہ ہر طرح کے جائز طریقے کام میں لا دیں گے کہ مرکزی راج ان کی طرف اور دوسروں کی طرف سوا دلہن کی نیتی پر چلے۔ ان پنچائتوں کی نگاہ میں دنیا کا ہر

دیش ویسی ہی ایک اِکائی ہوگا جیسی اپنے دیش میں ایک پنچائت اِکائی ہے۔ ان کی یہ بنیادی مانگ ہوگی کہ ہر دیش دوسرے دیش کے ساتھ سواولہن کے اصول پر سمبندھ جوڑے۔ جو دیش جس بات میں اس نیتی کو نہ مانیں گے اُن کے ساتھ ہمارا دیش ان باتوں میں سہہ یوگ نہ کرے گا۔ آج کل ہر دیش اور ہر گروہ ایک دوسرے کو چوسا اور ایک دوسرے سے بے جا فائدہ اٹھانا اپنا حق اور ایمان سمجھتا ہے۔ اس حالت کو دیکھتے ہوئے سواولہن کی نیتی بڑی انقلابی نیتی ہے۔ اُسے ماننے کے لئے کوئی ملک بھی آسانی سے تیار نہ ہوگا۔ پر راستے کی کٹھنٹیاں ان پنچائتوں کو ان کے سیدھے راستے سے نہ ہٹا سکیں گی۔ انھیں کٹھنٹیاں کو دور کرنے کے لئے دُنیا میں ان پنچائتوں کا جنم ہوا ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ یہ پنچائتیں اپنی ان دردہنی شکیتوں کو چاہے وہ مقامی ہوں یا مرکزی، دور کرنے کے لئے کیا کیا راستے نکالیں گی۔ اس کا عملی طریقہ اس ددھان میں دیا ہوا ہے۔ ہم اُسے نیچے دیتے ہیں۔

اس سئے ہمارے اس صوبے (لو۔ پی) کی حکومت گھاؤں گھاؤں میں پنچائتیں قائم کر رہی ہے۔ باپو کی پنچائتیں انھیں پنچائتوں کے ساتھ ساتھ قائم ہوں گی۔ سرکاری پنچائتوں کے پاس ساری قانونی شکتی، ادھیکار اور سادھن ہیں۔ باپو کی پنچائتوں کے پاس کیول اپنے سبکوں کی سوارتھ سیوا اور مالو پریم کی شکتی ہے۔ سرکاری پنچائتیں سرکار کی نیتی کو چلانے میں مدد دیں گی جیسے یہ کہ گھاؤں میں پارلیمنٹی راج کے چاروں چرن جن کی ہم نے اوپر چرچا کی ہے اور ان چروں پر دھڑ اور سر کے روپ میں مشین راج اور فوج راج قائم ہوں۔

باپو کی پنچائتوں کی نیتی سگر سیوا اور سوا ولبن ہوگی جس کی بنیادی غرض گاؤں کے جیون کو بھیجی سمیٹنا اور پارلیمنٹی راج سے آزاد کرنا ہی۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری پنچائتیں اور باپو کی پنچائتیں دو الگ الگ شکلیاں ہیں ایک بھوتیک (مادی) اور ایک نیتیک (اخلاقی) یہ دونوں گاؤں کو اپنے اپنے مالی، سماجی اور راج کا جی سانچوں میں ڈھالنا چاہیں گی۔ اوپر سے دیکھنے میں یہ دونوں پنچائتیں گاؤں کی حکومت چاہیں گی اور گاؤں کے سادھنوں پر قبضہ پا کر اپنے اپنے ڈھنگ سے گاؤں کا کام چلانا اور اس کی حالت سدھارنا چاہیں گی۔ پر اصلیت یہ نہیں ہے۔ ان دونوں طرح کی پنچائتوں کے مقصدوں اور کام کے طریقوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سرکاری پنچائتیں سرکار کے دھن اور اس کے ادھیکار کی مدد سے جتنا کو مرکزی حکومت کے بس میں رکھ کر اس کو حکومت کی مرکزی اور نیتی پر چلانا چاہتی ہیں۔ باپو کی پنچائتیں اپنے گاؤں کو سوا ولبنی بنا کر اسے ہر طرح کے باہری دباؤ سے پوری طرح آزاد رکھیں گی، اور اس آزادی کے حامل کرنے کے لئے گاؤں والوں میں جاگرتی اور شکرتی پیدا کریں گی۔ وہ جتنا کو گاؤں کا سچا راجہ اور گاؤں کی پنچائت کو کسی باہری راجہ کا نہیں اسی راجہ کا سچا سیوک بنائیں گی۔

اس مقصد کے حامل کرنے کا باپو نے ان پنچائتوں کے سامنے ایک سیدھا سادا راج کا جی راستہ رکھ دیا ہے، اسے ہم نیچے دیتے ہیں۔

”ہر کام کرنے والا اس بات کو دیکھے گا کہ جن لوگوں کے نام قانونی دواڑوں کے رجسٹر میں درج ہونے سے رہ گئے ہیں ان کے نام اس

رجسٹر میں باضابطہ درج کر لئے جاویں۔

”ہر کام کرنے والا ان لوگوں کو جن میں ابھی تک ووٹرشپ کی قانونی یوگیتا نہیں ہے اس بات کے لئے بڑھاوا دے گا کہ وہ ووٹ کا ادھیکا پانے کے لئے اپنے اندر اس یوگیتا کو پیدا کر لیں۔“

سب جانتے ہیں کہ پارلیمنٹی حکومت پر قبضہ پانے کا قانونی طریقہ چناؤ میں کھڑے ہونا اور کامیابی حاصل کرنا ہے۔ یہ چناؤ دیش کو ان خانہ جنگیوں سے بچانے کے لئے جو طرح طرح کی راج کاہی پارٹیاں راج گدی پھیننے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ کرتی ہیں پیدا ہوا تھا۔ ہنسا بھرے انقلابوں سے بچانے کا یہ اہنسا کا ایک طریقہ تھا۔ پر پچھی سمجھتا نے راج کاہ کو سدا چار سے پوری طرح آزاد کر دیا اس لئے اوّل تو ان چناؤں میں خود حد درجے کی ہنسا بھر گئی، دوسرے چناؤ کے رہتے ہوئے بھی راج کاہی پارٹیاں جبری اور ہنسا بھرے انقلابوں کے طریقے برابر کام میں لاتی رہتی ہیں۔ اس لئے اگر چناؤ ایمان اور انصاف کے سانچہ کیا جاسکے تو اس سے اچھا ڈھنگ دیش کو پارٹی بازی کی مصیبتوں اور گھریلو لڑائیوں کی بربادیوں سے بچانے کا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، باپو نے ادھر کی دلوں دغاؤں میں اپنی پناتوں کا دھیان ددڑوں کی طرف دلایا ہے۔ اگر ایک بار ددڑوں کے دل میں یہ جم جاوے کہ جتنا کے سچے نمائندے اور کشک ہم ہی ہیں اور اچھی بری حکومت بنانے کی ساری ذمہ داری ہمیں پر ہے اور ہمیں اس ذمہ داری کو کسی پارٹی کے بھلے کے لئے نہیں بلکہ کل گاؤں کے بھلے کے لئے پورا کرنا چاہیے تو آج کل کے چناؤ کا روپ بالکل بدل سکتا ہے۔ بربادی کا ذریعہ ہونے کی جگہ یہی چناؤ تابھ

اور رچنا کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

دوڑوں میں اس ذمہ داری کی سمجھ پیدا کر دینے کے ساتھ ساتھ ان پینچائٹوں کو اپنے علاقے کی جنتا میں اتنی جاگرتی اور طاقت پیدا کر دینی چاہئے کہ وہ کسی پارٹی کو کسی دوڑ پر ناجائز دباؤ نہ ڈالنے دیں۔ یہ پارٹیاں جنتا کی مدد اور سہمہ یوگ سے ہی طاقت پکڑتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔ یہ جنتا کو طرح طرح کے دھوکے دے اور جھوٹے وعدے کر کے الگ الگ عکڑوں میں بانٹ دیتی ہیں اور پھر ایک ٹکڑے کو دوسرے سے لڑاتی راہتی ہیں۔ گھاؤں کی جنتا ایک ہے، اس لئے اس کا کوئی بھی عکڑا برباد ہو اصل میں بربادی گھاؤں اور جنتا ہی کی ہے۔ باپو کی پینچائٹیں اسی بات کی سمجھ دوڑوں اور جنتا میں پیدا کریں گی۔ چونکہ چٹاؤ میں ان کا کوئی اپنا فائدہ نہ ہوگا اس لئے جنتا ان کی بات سننے کی اور اس پر عمل کرے گی۔ اگر اس عمل کرنے میں اندر کی یا باہر کی کوئی شکنتی جنتا کو زیر دستی دبانے کی کوشش کرے گی تو یہ پینچائٹیں جنتا کو پیچھے ہٹا کر اپنا سینہ سامنے کریں گی۔ یہی راستہ سچے سچا گراستہ ہے۔ اسی سے گھاؤں میں وہ شکنتی اور وہ ایسا پیدا ہو جائے گا جس کا کوئی درودھی شکنتی مقابلہ نہ کر سکے گی۔ اس طرح دوڑ اور چٹاؤ دونوں جنتا کے ہاتھ میں ہو جائیں گے اور جنتا نیک اور سچے لوگوں کو چٹاؤ میں جتاسکے گی جو چٹے جانے کے بعد بھی جنتا کے سچے سینوک بنے رہیں۔

آج کل چٹاؤ میں دوڑ بے چارے امیدواروں اور اُن کی پارٹیوں کے بہکاوے، دباؤ، رشتے، جھوٹے وعدوں یا پارٹی بازی کی آستلوں میں آکر دھٹ دیتے ہیں۔ جنتا کو یہ سمجھنا ہوگا کہ آخر یہ

پارٹیاں کس کے روپے اور کس کے بل پر چل رہی ہیں، اور جس کے بل پر چل رہی ہیں اُسے ہی ٹکڑے ٹکڑے کر کے مٹا رہی ہیں۔ اگر جنتا سنگٹھن کر کے ان سب پارٹیوں سے اسہہ یوگ کر لے تو یہ پارٹیاں بالکل بے بس اور بے کار ہو جائیں اور جنتا ان سب کھینچا تانہوں اور بربادیوں سے بچ جاوے۔

اِس سئے جو نیک اور اچھے لوگ ہیں اور جن پر پُرانی سمجھتا اور دین دھرم کا اثر ابھی کچھ باقی ہے وہ اپنے آس پاس بُرائی اور بربادی کے اِس طوفان کو دیکھ کر دکھی ہوتے ہیں اور حُپ ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ لوگ ایک بار اس بات کو سمجھ لیں کہ بھیجی سمجھتا کے اِس ننگے تاج کو اپنے علاقے میں سے مٹا دینا ان کا دھرم ہے اور ان میں اس کی ہستی بھی ہے تو وہ کچھ ہی دلوں میں اس کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔

اِس سئے کی سب سے بڑی کھٹنائی یہ ہے کہ نیک اور اچھے لوگ اپنے اپنے علاقوں کے بہکے ہوئے نا سمجھ اور غلط راستے پر پڑے ہوئے لوگوں سے اپنے علاقے کی رکشا نہیں کر سکتے۔ اِس کا کارن یہ ہے کہ ان نیک اور اچھے لوگوں کا کوئی سنگٹھن نہیں ہے۔ دوسری طرف غلط راستوں پر پڑے ہوئے لوگوں کا سب کا اپنا اپنا سنگٹھن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شروع میں ان نیک اور بے لاگ لوگوں کو نقصان اُٹھانا پڑے۔ پر اِس نقصان کو سہہ لینا ہی ان کا دھرم ہے۔ اِس طرح کا تیاگ جنتا کو بڑی سے بڑی بربادی سے بچا لے گا۔ کانگریس کے تھوڑے سے تیاگ نے بڑی سے بڑی حکومت کے پاؤں اُکھاڑ دیئے۔ اِس لئے ضرورت اِس سے کیوں اس بات کی ہے کہ ہر علاقے کے اور ہر شہر کے نیک، سچے اور با اثر جو آج کل کی حالت اور پارٹی

بازیوں سے پریشان اور دکھی ہوں اور اس سے دیش کی بربادی کو دیکھ رہے ہوں ایک بار اپنا سنگٹھن کر کے کھلے طور پر اور بہت کے ساتھ اس بُرائی کا مقابلہ کریں پھر وہ دیکھیں گے کہ تھوڑے ہی دنوں میں ملک کی حالت بدل جاوے گی۔

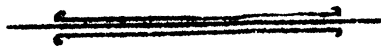
ہر علاقے میں اسی طرح کے سنگٹھن کی ضرورت ہے۔ اس سنگٹھن کے لوگ اپنے آپ کو چٹاؤ کی لاگ ڈالیں اور پرلو بھنوں سے دور رکھیں گے۔ وہ خود حکومت کی گدی پر نہ بیٹھیں گے۔ وہ ادھیکار کے دائروں سے خود الگ رہ کر جتنا کے جیون کی اور ان دائروں کی بھی رکشا کریں گے۔ اس سے دیش میں اور ہر علاقے میں ایک ایسی نیتک شکتی پیدا ہو جائے گی جو راج شکتی سے الگ رہتے ہوئے بھی اس شکتی کو اپنے سامنے بٹھکا سکے گی اور اُسے دیش کا سچا سیوک بنا سکے گی۔ باپو کا ددھان اسی الگ اور برابر کی گورنمنٹ کا سندیش دیش کے سامنے لایا ہے۔

اس ددھان کی پچائیتوں کا کام اپنے علاقے میں اسی طرح کے سنگٹھن پیدا کرنا ہے۔ اپنی سیوا سے علاقے کے بھلے لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر سگر سیوا، سواد لمبن، ستیہ اور اہنسا کی ہوا پیدا کر دینا ہے، جو آج سے سو برس پہلے ہمارے گائوں میں موجود تھی۔ ان پچائیتوں کا کام ہوگا کہ دو ٹروں کی بابت جو ہدایت باپو نے دی ہے اُسے سامنے رکھ کر اپنے علاقے کے دو ٹروں کو اپنے سنگٹھن کا ایک ایسا حصہ بنالیں جسے راج کا جی پارٹیاں اُن سے الگ نہ کر سکیں۔ پھر ان دو ٹروں کے ذریعے سے، خود باہر رہتے ہوئے، ایسے سچے اور نیک سیوکوں کو چٹاؤ

میں کامیاب بنوادیں جن پر جتنا کو یہ پورا اعتبار ہو کہ وہ مچنے جانے کے بعد جتنا کی پہنچ سیدھا کریں گے۔

گاؤں کی ان پنچائتوں میں اتنا ہی نہیں، انھیں جب چاہیں ان سیوکوں کو ہٹا دیں گا ادھیکار بھی اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔ جب یہ سب باتیں ہو جائیں گی تب ہی وہ اپنے علاقوں کو پرانی پنچائتوں کی طرح پوری آزادی دے سکیں گی۔ تبھی وہ اپنے علاقے کی آرٹھک نینٹک اور سماجی آزادی کو پیچھی سبھیتا کی غلامی سے بچا سکیں گی۔ اسی مہان اڈیش کے لئے بالوں نے یہ ددھان اور یہ لوک سیوک سنگھ بنایا ہے۔ اور ان کا یہی سنگٹھن دیش کی وہ پیرل گورنمنٹ ہوگی جسے بالوں کا ددھان قائم کرنا چاہتا ہے۔

ہر انقلاب کے پیدا کرنے کے لئے ایک مقصد، ایک سنگٹھن، ایک پروگرام اور ایک ہتھیار اور ان کے ساتھ ساتھ ایک گروہ اور ایک شکنتی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے ددھان میں بالوں نے یہ ساری باتیں رکھ دی ہیں۔ ہم نے تپھلے حصوں میں ددھان کے مقصد، اس کے سنگٹھن، اس کے پروگرام اور اس کے ہتھیاروں کا پورا نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگلے حصے میں ہم اس شکنتی اور ان سیوکوں کی چرچا کریں گے جن کے سپرد بالوں کے اس ددھان کو چلانے اور کامیاب بنانے کی ذمہ داری ہے۔



آتما کی طاقت

اب ہم اس شکتی اور ان سیوکوں کا چرچا کریں گے جن کی مدد سے باپو اپنے مقصد کو پورا کرنا چاہتے تھے اور جن کا انھوں نے اپنے دھان میں ذکر کیا ہے۔

پہلے ہم شکتی کو لیتے ہیں۔ باپو ستیہ اور اہنسا میں اور اُن سے پیدا ہونے والے آتما کے بل میں اٹل دشواں رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ کبھی سمیٹتا کے اثر نے ہمیں اتنا چکا چوندہ کر دیا ہے کہ اپنی سمیٹتا کی اچھائیوں اور اس کی نیتک اور آتماک شکتیوں کی طرف ہماری نگاہ بھی نہیں جاتی۔ ہماری جھوپڑیوں کا محلوں میں بدلتے جانا، ہمارے پھکڑوں کا ریل گاڑیوں کا رڈپ لے لینا، ہمارا چڑیوں کی طرح آکاش میں اڑتے پھرنایہ سب ہماری نگاہ میں سمیٹتا اور اننتی کے ثبوت ہیں۔ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ جتنا جتنا اس طرح کی شکتیوں اور سادھنوں کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے اتنا اتنا ہی روائیاں مارکاٹ، بربادی اور طرح طرح کی کھینچ تانی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہتھیاروں، ہوائی جہازوں، زہریلی گیسوں اور ایٹم بموں نے ہمارے دلوں اور دماغوں پر ایسی گہری چھاپ ڈال دی ہے کہ جس سے ہماری عقل گم اور ہماری آنکھیں دھندھیا گئی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ان سب چیزوں کے ان بڑے نیتوں کو بھی نہیں سمجھتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کبھی سمیٹتا کی ساری شکتی اور اُن کے راج کا سارا آدھار فوجوں اور ہتھیاروں پر ہے۔ پر جہاں تک امن چین اور سکھ شانتی کا سوال

ہے وہاں تک نمود یورپ کی قوموں کی آج کل کی حالت رو رو کر دُنیا کو اپنی دکھ بھری کہانی سنا رہی ہے اور ان فوجوں اور ہتھیاروں کا سہارا بالکل دھوکے کی ٹٹی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہم نے باپو کے ساتھ نیا سئے نہیں کیا۔ باپو کا دعویٰ تھا کہ ستیہ اور اہنسا میں ویسی ہی شکلی ہے جیسی دُنیا کی کوئی اور شکلی۔ ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ اس شکلی پر لگ بھگ پچاس برس تجربے کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ ہم نے اُن کی ان باتوں کی طرف کبھی گہرائی سے دھیان نہیں دیا۔ پچھم کی ڈراڈنی اور گھانک شکلیوں کے سامنے ہیں باپو کی اہنسا سدا بے کار محسوس ہوئی۔ ہم نے کبھی ٹھنڈے دل سے اتہاس اور تجربے کی روشنی میں ایک سچے سائنس دانے کی طرح ان دونوں طرح کی شکلیوں اور ان کے نتیجوں کو تول کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم بُدھی داد اور دلیلوں کی بات کرتے ہیں پر جہاں تک نیکی اور بدی کا سوال ہے ہم کچھ سمجھتا کی دکھاؤنی ٹڑک بھڑک کے موہ جال میں اسی طرح پھنس گئے ہیں جیسے ہمارے ہی دیش کے بہت سے ریت رواج کے پجاری اپنی آج کل کی کھوکھلی روڑھیوں اور جھوٹی ہٹ دھرمیوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس موہ جال میں ہم اتنے گہرے پھنس گئے ہیں کہ خود اپنے اور اپنے دیش کے حال کے تجربوں سے بھی ہم فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ہمارے اچھے اچھے بُدھی دادی باپو کو جادوگر اور اُن کے کاموں کو جادو یا آدمی کی بُدھی سے باہر کی چیز کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ چیزوں کو اس طرح سے دیکھنا نہ سائنس ہے اور نہ بُدھی داد۔ ہم باپو کی صلاحوں کو غیر عملی اور ان کے

وچاروں کو کیول آدرش سمجھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں یہ بات بڑی عقل کی معلوم ہوتی ہے کہ دوسرے دیشوں کے پڑانے کنڈم کئے ہوئے جہاز اپنی رکشا کے لئے خریدیں اور دیش کی گاڑھی کمائی کو اسی طرح کے ہوائی جہازوں، توپوں، بموں اور بندوقوں کے خریدنے اور بنانے کی کوششوں میں لگا دیں۔ ہم اپنی کھلونا فوج بنانے میں اتنے مگن ہیں جتنے اپنے ربیتی کے محل بنانے میں ہوتے ہیں۔

ستیہ اور اہنسا یا کسی بھی نئی چیز میں کسی کو کتنا بھی گہرا دھواں کیوں نہ ہو اور اس دھواں کو وہ کتنے ہی زور دار شبدوں میں کیوں نہ پرکٹ کرے، اور کتنی ہی زبردست دلیلیں کیوں نہ دے، دنیا پر اس کا اس تئے تک کوئی اثر نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے اصولوں کو دنیا کے سامنے کسی عملی صورت میں پیش نہ کرے۔ تبھی وہ دنیا کو اس کے آج کل کے غلط راستے سے ہٹا کر ٹھیک راستے پر لیجانے کی آشا کر سکتا ہے۔ مزدورت اس بات کی ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا راستہ جو چالو راستے سے زیادہ سیدھا اور اچھا ہو دنیا کے سامنے آدے اور دنیا کو اُسے دیکھنے اور آزمانے کا ادھر لے۔ اس کے بعد اگر لوگوں کو تسلی ہو جاوے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ دھیرے دھیرے اپنے پڑانے راستے کو چھوڑ کر نئے پر نہ چلنے لگے۔

اسی لئے ہاپونے اپنے پدم گرام کو بمبھوں اور دیلیوں کے ساتھ پیش کرنے کے بجائے اسے علی روپ دینا، اسے پریوگوں کی کسوٹی پر کسنا اور اس پر کھلے عمل کر کے دکھانا ادھک اہیت سمجھا اور اپنی ساری شکتی اس میں لگا دی۔ ہم یہاں ہاپونکی سب کھوجوں اور ان کے پریوگوں کے دستار میں نہیں جاسکتے۔

اُن کے جیون کے ان پہلوؤں پر بھی بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن سے جو چاہے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہاں ہم سرسری طور پر باپو کے کچھ پریلوگوں کے نتیجوں پر ایک نگاہ ڈالیں گے۔

جس شکتی کو باپو آدمی کو سدھارنے کے لئے تلواروں کی جگہ دینا چاہتے تھے وہ شکتی مانو پریم کی شکتی ہے۔ قیمتی شاستر اور آتم ودیا کے بڑے بڑے جانکاروں نے ہزاروں سال سے اس شکتی کا پتہ لگا رکھا تھا۔ جس طرح لوگ مادی طاقتوں کی چھان بین میں لگے رہے ہیں اسی طرح روحانی طاقتوں کے سمجھنے اور جاننے والے ان طاقتوں کی چھان بین میں بھی اسی گن کے ساتھ ہمیشہ لگے رہے ہیں۔ انھیں اپنی اس کھوج میں اتنی ہی کامیابی ملی ہے جتنی مادی شکتیوں کی چھان بین کرنے والوں کو۔ ان روحانی شکتیوں کے جانکار اپنی کھوجوں سے انسانی دنیا کو دیے ہی فائدہ پہنچاتے رہے ہیں جیسے مادی شکتیوں کے پنڈت اپنی کھوجوں سے۔ انسانی دنیا کا اتہاس جب اس نگاہ سے لکھا جاوے گا تب ہمیں یہ دکھائی دے گا کہ روحانی طاقت اور پریم کی طاقت کے اصلی پریلوگ سے انسانی دنیا کو جتنا فائدہ پہنچا ہے اتنا مادی ایجادوں سے نہیں پہنچا۔ یہ ایک یکتا بات ہے کہ دھیرے دھیرے مانو پریم کی شکتی مانو جیون کے ارتھک، فینک اور سماجی دائروں میں تلوار کی شکتی پر دے پاتی جا رہی ہے اور دھیرے دھیرے بڑے سے بڑے پیالوں پر اس نے تلوار کی شکتی کو ان دائروں سے نکال کر ان کی جگہ لے لی ہے۔ اتہاس اس بات کو ثابت کر دے گا کہ جسے ہم کلچر اور سنسکرتی کہتے ہیں وہ اصل میں دھیرے دھیرے اہلسا تنک پر درگراؤں

ریت رواجوں اور قانونوں کا ہنسنا تمک ریت رواجوں پر وگراہوں اور قانونوں کی جگہ لے لینا ہے۔

بیچھی سمیٹتا کے اٹھان کے بعد سے یہ صورت کچھ تھوڑی سی بدل گئی۔ پر اتہاس ہمیں بتاتا ہے کہ اس دور میں بھی آدمی جانے یا انجانے اسی شکنتی کو بڑھانے اور اس کا سنگٹھن کرنے کو اپنا اصلی لکش یا مقصد بنائے رہا۔ پھر کیا کارن ہے کہ یہ شکنتی تلوار کی شکنتی پر آخری درجہ حاصل نہ کر سکی اور آج تلوار ہی اس شکنتی پر چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے کچھ کارن ہم نیچے دیتے ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ تلوار کا اس شکنتی کو ہرا دینا یا دبا دینا کیوں ایک سطحی اور چند روزہ چیز ہے۔ بڑے درجے تک یہ ہماری نگاہ کا دھوکہ ہے۔ یہ صورتیں اس واسطے پیدا ہو گئی ہیں کہ پچھلے دو تین سو سال کے اندر ہماری دنیاوی یا مادی ترقی ہماری نیتک اور روحانی ترقی کی نسبت زیادہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھی ہے۔ اس سے پہلے ہماری دینی دھرمی اور نیتک سنسٹھائیں سنساری اتنی کو سدا چار اور روحانیت کے ادھین رکھ کر مانو جیون میں ایک بہت اچھا اور تندرست سمٹول بنائے رکھتی تھیں۔ بیچھم کے اٹھان نے اس سمٹول کو برباد کر دیا۔ اسی لئے تلوار کی شکنتی مانو پریم کی شکنتی پر حاوی دکھائی دینے لگی۔ پر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ سنساری رکادھیں جو آدمی کو انسانی بھائی چارے اور لوک راج کے سانچے میں ڈھلنے سے روکتی تھیں اتنی تیزی کے ساتھ اور اتنی اچھی طرح دور ہوتی جا رہی ہیں اور ہو گئی ہیں کہ جو پچھلے ہزاروں سال میں بھی نہ ہوئی تھیں۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ لڑائی اور مار کاٹ کے طوفان

آدمی کے دل اور دماغ کو ہلا کر تلوار کے خطروں اور اس کی بربادیوں سے ڈرا ڈرا کر بھونچکا کر رہے ہیں۔ لوگ اس طوفان سے اس حد تک گھائل اور پریشان ہو گئے ہیں کہ دُنیا کے اتھاس میں پہلی بار وہ بچے دل سے ایسی صورتوں کی کھوج میں ہیں جو آدمی کو کسی طرح آج کل کی بربادیوں سے بچا سکیں۔

(۳) تیسرے دُنیا کی وہ نیتک اور ردحانی شکستیاں جو تھوڑے دنوں کے لئے تلوار کی چکا چوندھ سے دب گئی تھیں، ان میں اب دوبارہ ایک نئی جان، نئی طاقت اور نیا سنگٹھن پیدا ہو رہا ہے۔ اب اگر ایک بار ان شکستوں کا سنگٹھن ہو گیا تو تلوار کا دور ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائیگا۔

(۴) چوتھے بابو کے جنم اور اُن کی کامیاب کوششوں سے ایک نیا پروگرام اور نیا ہتھیار دُنیا کے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ پروگرام اور یہ ہتھیار تھوڑے ہی دنوں میں نیتک اور ردحانی سنگٹھنوں کو اہنسا کے طریقوں پر تلوار کی شکست سے سیدھے ٹکرائیے کے لئے تیار کر دیں گے، اسی کے ساتھ ساتھ جو لوگ اب تک اہنسا کے طریقوں پر اس لئے کھڑے ہیں کہ وہ اُسے آدمی کی بھلائی، ترقی اور رکشا کا ایک راستہ سمجھتے ہیں، کسی ایسے دوسرے راستے کے سامنے آتے ہی جس سے انہیں بھلائی کی کچھ اُمید دکھائی دے گی، خود بخود اس کی طرف جھک جا دیں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ دُنیا نے تلوار کے استعمال کو کیوں جاری رہنے دیا۔ اس کا کارن راج کاجی اور آرتھک ہے۔ تلوار سی ویش یا گروہ میں کیول سدھار ہی کا کام نہیں کرتی تھی بلکہ رکشا کا کام بھی کرتی تھی۔ اس میں دو دائرے اس کے سپرد ہوتے تھے۔ ایک اندر کی رکشا اور دوسرے باہر سے رکشا۔ اتھاس بتاتا ہے کہ

جہاں تک اندر کی رکشا کا سوال تھا وہاں تک مانو پریم کی شکتی کے جانکاروں نے ہر دیش اور ہر سمیتا میں ایسے ایسے طریقے پیدا کر لئے کہ جنہوں نے دھیرے دھیرے شہری جیون سے فوجوں کی ضرورت کو بالکل مٹا کر اُسے غیر فوجی پولیس اور عدالتوں کے سپرد کر دیا۔ پہلے ہر آدمی کو اور ہر گروہ کو اپنی رکشا کا خود ادھیکار ہوتا تھا۔ اس ادھیکار کو کام میں لانے میں ہر آدمی عام طور سے ہتھیاروں سے کام لیتا تھا یا اپنے مددگاروں کو ہتھیار دے کر دوسرے سے خود فیصلہ کر لینے میں مدد لیتا تھا۔ اور یہ بات جائز سمجھی جاتی تھی۔ دھیرے دھیرے اس طرح کی باتیں مانو جیون سے ختم کر دی گئیں۔ ہر آدمی کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دی گئی اور سب طرح کے آپسی جھگڑے چکاتے کیلئے ہتھیاروں کے استعمال کی جگہ عدالتوں اور دوسری اسی طرح کی مستحاضوں سے کام لینا سب کے لئے ضروری کر دیا گیا۔ پولیس کی سنسٹھا بھی اسی طرح فوج کی جگہ ایک غیر فوجی سنسٹھا بنی جس کا کام شروع میں غیر فوجی ڈھنگ سے شانتی قائم رکھنے میں مدد دینا تھا۔ اس طرح کی پولیس کو بھی عدالتوں کے ادھین رکھ کر ان کے ہنسا کے دائرے کو ایک بہت بڑے پیمانے پر اہنسا میں بدل دیا گیا۔

اگر مانو اتنی کا دائرہ کل مانو جاتی ہوتی اور کل انسان ایک ہی حکومت کے نیچے ہوتے تو یہ پر بندھ اور یہ پروگرام ایسا تھا جس نے آج سے ہزاروں سال پہلے ہی انسانی دنیا سے تلوار کے استعمال کو مٹا دیا ہوتا۔ پر کمٹھائی یہ تھی کہ جہاں تک راج کالج کا سبندھ ہے آدمی پھوٹے چھوٹے ہزاروں ایسے ٹکڑوں میں بٹتا رہا ہے کہ جو ایک دوسرے سے بالکل آزاد ہوتے تھے۔ یہ نیا وارہ اہنسا اور بھوکولی

کاروں سے ہوتا تھا۔ شروع شروع میں ان میں سے ہزاروں گروہ اپنے رہن سہن، کھان پان، دھرم مذہب، پیشوں، سنگٹھن کے طریقوں اور آدرشوں میں بالکل ایک دوسرے سے الگ اور اکثر ایک دوسرے کے خلاف سانچوں میں ڈھل جاتے تھے۔ پھر ایک بار الگ الگ سانچوں میں ڈھل جانے کے بعد قدرتی طور پر اپنے پُرانے ڈھانچوں سے ہی چپٹ رہنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے یا اپنے گروہ کے ریت رواجوں سے اتنی محبت کرنے لگتا ہے کہ پھر انھیں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ پھر اسکے لئے ان سانچوں کو بدلنا لگ بھگ ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح الگ الگ جاتیاں، الگ الگ قومیں، الگ الگ پگھر اور الگ الگ رائٹربن جاتے ہیں اور یہ سب الگ الگ حالتوں میں رہ کر الگ الگ سانچوں میں ڈھلے ہوتے ہیں۔ پھر جب اتھاس کے الگ پھیر یا بھوگولی شکتیاں انھیں ایک دوسرے سے پاس لائیں یا انھوں نے انھیں ایک دوسرے سے ملایا تو ایک دوسرے سے اپنی رکشا کے لئے ان کے پاس تلوار کے سوا اور کوئی سادھن تھا ہی نہیں اسی لئے یہ تلوار کام میں لانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

کچھ ملکروں کے بعد ایک دوسرے کو جیت کر راج کاجی نگاہ سے یہ ایک دوسرے میں مل جانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد ان کے اندر کے سماجی اور مالی پہلوؤں پر مافوق پریم کی سشکتی دھیرے دھیرے اپنا اثر پھیلا کر ان کے آپسی فرقوں کو مٹا مٹا کر انھیں ایک بھائی چارے یا راج کاجی اور مانی برادری میں ڈھال دیتی تھی اور ان میں ایکتا اور اک رنگا پن پیدا کرتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ اس طرح کے ملے ہوئے گروہوں میں اپنے آپسی سمبندھوں اور

سنگٹن کے لئے تلوار کی کوئی ضرورت یا گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔ یہی حالت دنیا کی آج تک باقی ہے۔ اس حالت کو زیادہ بڑی اور پھیلی ہوئی انسانی بنیادوں پر لانے کے لئے اتھاسی اور بھوگولی شکتیاں پہلے سے کہیں بڑے پیمانے پر اپنا کام کر رہی ہیں۔

اب چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی جگہ دنیا میں بڑی سے بڑی حکومتیں اور چھوٹی چھوٹی کچھوڑوں کی جگہ بڑی سے بڑی سپلر میں اور سمجھتائیں بن رہی ہیں اور بن گئی ہیں۔ پھر بھی ابھی اتنی الگ الگ آزاد حکومتیں اور قومیں باقی ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے اپنی رکشا کیلئے ابھی تک تلوار کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ جب تک یہ ضرورت اس روپ میں باقی رہے گی تب تک آدمی کے دل میں تلوار کو کام میں لانے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی اچھا بنی رہے گی اور تب تک تلوار انسانی دنیا سے رٹ نہ سکے گی۔

پھر اب یہ ساری حالت جڑ سے بدل رہی ہے۔ ماؤ سنسار کی آج کل کی حالت اور اس کے آج کل کے سنگٹن پر نگاہ ڈالنے سے ہمیں ایک دوسرا پہلو دکھائی دیتا ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جن شکستیوں کی ہم نے ادھر چرچا کی ہے انھوں نے ماؤ سنسار کی حکومتوں، سنسکرتیوں اور قوموں کی تعداد پہلے سے بے حد کم کر دی ہے۔ آج تھوڑی سی بڑی بڑی حکومتیں قائم ہو گئی ہیں اور انکی شکستی اور سادھن اتنے ادھاک ہیں کہ ان کے سامنے چھوٹی حکومتوں کی کوئی حقیقت ہی باقی نہیں رہی۔ آج کل مشین کے دہرے ہتھیاروں کو بھی بڑی بڑی مشینوں کا روپ دے دیا ہے۔ اس انقلاب نے چھوٹی حکومتوں کو بڑی حکومتوں کے سامنے بالکل بے بس

اور لاچار کر دیا ہے۔ اس لئے آج تلوار دنیا کی چھوٹی قوموں اور ملکوں کی اس طرح رکشا نہیں کر سکتی اور انہیں آزاد نہیں رکھ سکتی جس طرح پہلے رکھتی تھی۔ اپنی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے آج یہ سب کسی دوسری طاقت یا سنگٹھن کے محتاج ہو رہے ہیں۔

اگر ہم آج کی راج کابھی حالت پر نگاہ ڈالیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بڑی بڑی مشینوں والے ہتھیاروں اور بڑی بڑی فوجوں کو بڑے سے بڑے پیمانے پر کام میں لانے کی شکتی دنیا کی تین قوموں کے ہاتھ میں آکر جمع ہو گئی ہے۔ امریکہ، انگلستان اور روس۔ ان میں سے ہم امریکہ اور انگلستان کو اس معنی میں ایک ہی حکومت کہہ سکتے ہیں۔ اب جہاں تک پہلی راج کابھی آزادی کا سوال ہے وہاں تک دنیا میں کیوں دو ہی حکومتیں پورے طور پر آزاد رہ گئی ہیں۔ امریکہ اور روس۔ باقی ساری حکومتیں دیکھنے میں آزاد ہیں پر سچ یہ ہے کہ اپنی آزادی بنائے رکھنے کے لئے ان کا تلوار پر جو بھروسہ تھا وہ ہمیشہ کے لئے مٹ چکا۔ ہم ہمیشہ کے لئے اس لئے کہتے ہیں کہ جو بڑی بڑی مشینوں کی شکل کے ہتھیار آج کل کام میں لائے جا رہے ہیں ان کا بنانا، ترقی دینا اور بڑھانا ایسے سادھن چاہتا ہے کہ جو روس اور امریکہ کے سوائے کسی دوسرے کے پاس ہیں اور نہ ان حالات میں ہو سکتے ہیں۔ اور اگر کوئی بھی بڑی حکومت ان دو حکومتوں کی جگہ لے لے تو وہ بھی ان چھوٹی حکومتوں کو سدا اس طرح کے ہتھیار بنانے سے روکے گی۔ نتیجہ یہ کہ اب چھوٹی حکومتیں ہتھیاروں کی مدد سے ہرگز اپنی آزادی یا اپنے ادھیکاروں کی رکشا نہیں کر سکتیں۔ چھوٹی حکومتوں

سے ہمارا مطلب اُن حکومتوں سے ہے جو اس طرح کے ہتھیار بنانے کی دَور میں روس اور امریکہ سے پیچھے رہ گئی ہیں چاہے اُن میں کمیوں کی گنتی، دیش کا پھیلاؤ یا دوسرے سادھن کتنے بھی زیادہ کیوں نہ ہوں۔

دوسری طرف دُنیا کی حالت بتا رہی ہے کہ یہ دو بڑی حکومتیں بھی بہت دنوں تک اپنے الگ الگ وجود کو اسی طرح قائم نہیں رکھ سکتیں۔ یا تو یہ صلح اور سمجھوتے کر کے ایک دوسرے سے مل جائیں گی اور یا ایک دوسرے سے لڑ کر کوئی ایک دوسری پر قبضہ جمائے گی۔ ایسی صورت میں جیتی ہوئی حکومت ہاری ہوئی حکومت سے اس طرح کے ہتھیار بنانے کا ادھیکار پوری طرح چھین کر اُسے ہمیشہ کے لئے اپنا محکوم اور محتاج بنائے گی۔ اس طرح دُنیا کی حالت بتا رہی ہے کہ ساری انسانی سمجھنا، جہاں تک اُس کا راج کا جی پہلو ہے اور اُس پہلو کا تلوار سے سمبندھ ہے، ایک بڑی حکومت کے ادھین ہونے جا رہی ہیں۔ اس بہاد کو کوئی شکستہ روک نہیں سکتی۔ اس سچائی کو نہ سمجھنا آج کل کی دُنیا کے سب بڑے انقلاب سے بے خبر رہنا ہے۔ یہ بات کسی بھی دیش یا راشٹر کیلئے بہت خطرناک ہے۔ ایسی حالت میں ہر سمجھدار آدمی کو یہ ماننا چاہئے کہ اپنے راج کا جی جیون کی رکشا اور آزادی کے لئے تلوار کو اپنا آخری بھروسہ اور سہارا سمجھتے رہنا کسی بھی راشٹر یا راج کے لئے بالکل بے کار اور بے معنی ہے۔

آج دُنیا کی لگ بھگ وہ حالت ہے جو ہندستان کی سنہ ۱۹۴۷ء کے اندر کے بعد تھی۔ ہندستان کی ساری فوجی اور راج کا جی طاقت ایک

نئی مرکزی حکومت کے ہاتھ میں آگئی۔ اُس نے دیش کا سنگٹھن اس ڈھنگ پر کیا کہ دیش کے ایک بڑے حصے سے تو دیشی راج بالکل ختم کر دیا اور دوسرے حصے میں دیشی راجاؤں کا راج بنائے رکھا۔ اگر وہ مرکزی حکومت چاہتی تو دیش سے سب دیشی حکومتوں کو ختم کر سکتی تھی پر اُس نے اپنے مطب کے لئے بہت سی دیشی ریاستوں کو قائم رکھا۔ انھیں ہتھیار رکھنے کی بھی اجازت دی۔ پر اپنی سلامتی اور اپنے ادھیکاروں کا اُس میں بھی پورا خیال رکھا۔ اُس نے ایک ایسی صورت پیدا کر دی کہ اوپر سے دکھائی دینے میں تو ہر دیشی ریاست خود مختار تھی اور ایک دوسرے کے خلاف اپنے کو آزاد مانتی تھی اور یہ بھی سمجھتی تھی کہ اُس کی یہ آزادی فوجوں اور تلوار کے بل پر قائم ہے۔ پر اصلیت میں یہ ریاستیں ہر معنی میں مرکزی حکومت کے محتاج اور غلام تھیں۔

لگ بھگ سو سال تک ہندستان کی یہی حالت رہی۔ ان چھ سو راج کاجی راجاؤں میں کوئی ایسا سنگٹھن یا کوئی ایسی شکستہ پیدا نہ ہو سکی جس سے یہ آپس میں مل کر اپنے آپ کو مرکزی حکومت سے بچے محضی میں آزاد کر سکتیں۔ ایسے ہی دیش کی تیس کروڑ آبادی بھی بہت کچھ اچھا رکھتے ہوئے بھی اپنے میں کوئی ایسی شکستہ یا سنگٹھن پیدا نہ کر سکی جس کے بل پر یہ اپنے آپ کو مرکزی حکومت کی فوجی طاقتوں سے آزاد کر سکتی۔

آج دُنیا کی بہت سی قومیں جن میں وہ بھی شامل ہیں جن کی تلواروں کا سکّہ دُنیا پر جما ہوا تھا جیسے جرمنی اور جاپان، اُس زمانے کے ہندستان ہی کی طرح نہ تھی ہو گئیں۔ اُن کی حالت کو دیکھ کر

اب ان کا ہتھیاروں کی مدد سے سچی آزادی حاصل کر لینا بالکل ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دُنیا ابھی اتنے بڑے انقلاب کے نتیجوں کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتی۔ اس کے لئے کچھ برسوں کی ضرورت ہے۔ پھر بھی جو حالت ہمارے سامنے ہے اُس پر اگر ہم ٹھنڈے دل سے اور بے لاگ ہو کر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ سچ مح اب دُنیا کی پینالوئے فی صدی حکومتیں تو اپنی آزادی تلوار اور فوجوں کی مدد سے بچا کر نہیں رکھ سکتیں۔

ہمیں اس پہلو کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہئے کہ دُنیا کی یرمکزی حکومت جتنا جتنا ہنساکے آدھار پر قائم ہوتی جاتی ہے اور جتنا جتنا اُس کی مرکزیت بڑھتی جاتی ہے اتنا اتنا ہی انسانی بھائی چارے اور مانو پریم کی طاقت مرکزیت سے دور ہوتی جاتی ہے، اتنا اتنا ہی آئیاے، ظلم اور دوسروں کا چوسنا یا بے جا فائدہ اٹھانا پھر بڑھنے لگے گا، الگ الگ راج کاجی اکائیوں کے ادھیکار بچ نہیں سکیں گے، نہ ان میں امن امان اور آرام چین کسی اچھے بیٹانے پر پیدا ہو سکیں گے۔ اس لئے دُنیا بھر کی ان سب اکائیوں کو ضروری طور پر اپنے ادھیکاروں کی رکشا اور اپنے بہانے کے امن چین اور شکہ شانتی کے لئے دوسرے شہزادوں میں اپنی سچی آزادی کے لئے کسی نہ کسی دوسری شکتی اور دوسرے سادھتوں کی طرف دیکھنا ہوگا۔ ہتھیاروں سے یہ اُس مرکزیت کا مقابلہ نہ کر سکیں گی۔ کوئی نہ کوئی شکتی ڈھونڈھنے کی طرف ان کا دھیان زوروں میں جائے گا۔ ایسی حالت میں باپو کے دکھائے ہوئے طریقوں کے سوائے کوئی دوسرا راستہ ایسا نہیں ہے

جس سے یہ اپنے بچاؤ کی آشا کر سکیں۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ آج کل کی حالتوں میں بہت جلدی وہ سنے آئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب دُنیا اہنسا اور مالتو پریم کے اُن پہلوؤں پر دھیان دینے کے لئے مجبور ہوگی جو باپو نے دُنیا کے سامنے رکھے ہیں۔ تب دُنیا ٹھنڈے دل سے اس نئی شکتی کی اصلیت اور اُس کے روپ کو سمجھنے کی کوشش کرے گی اور خود طرح طرح کے تجربے کر کے اس بات کو بھی سمجھ گی اور سیکھے گی کہ اس شکتی سے دُنیا میں کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ ابھی تک آتم بل کی شکتی کی طرف مت کیوں مذہبی، روحانی اور نیتک سنتھائیں ہی دھیان دیتی رہی ہیں۔ نیتک اور پچھری جیون میں ان سنتھاؤں نے آتم بل کو کام میں لانے کی بڑی سے بڑی کوششیں کی ہیں اور انھیں سچلتا بھی ملتی ہے۔ پر اس میں بھی شک نہیں کہ یہی سنتھائیں راج کاجی اور دوسری ہنسا کی شکتیوں سے اپنے کو ہمیشہ تلوار ہی کے زور سے بچانے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔ اس لئے ان سنتھاؤں میں بھی راج کاج ہی کی طرح تلوار کی ضرورت اور اُس کی ساری بُرائیاں برابر قائم رہی ہیں۔ یہی کارن ہے کہ یہ مذہبی سنتھائیں بھی مالتو پریم کی شکتی کو ایسا ہتھیار اور ایسا سارھن نہ بنا سکیں جس سے وہ راج کاج کے میدان میں، آتم بل کے ذریعے ہنسا تک حلوں پر قابو پاسکتی۔ ان سنتھاؤں کے لئے ابھی اب دُنیا بدل گئی ہے۔ اپنی ہی سلامتی اور اُنتی کے لئے انھیں بھی باپو کے اُمولوں اور پردگراہوں پر ٹھنڈے دل سے وچار کرنا ہوگا۔

آج کل کی حالتوں میں اگر مقابلہ کر کے یہ دیکھا جائے گا کہ انسانی دُنیا کو تلوار سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے یا ماؤ پریم سے اور دُنیا تلوار سے زیادہ سدھر سکتی ہے یا ماؤ پریم کی شکستی سے تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ دُنیا کے دکھی انسان ماؤ پریم کے حق میں فیصلہ نہ دیں اور اس نتیجہ پر پہنچیں کہ تلوار سے زیادہ بُرا کوئی سدھار کا طریقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم اپنے مطلب کو اور بھی صاف کر دینا چاہتے ہیں اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ماؤ پریم کی شکستی ماؤ سدھار اور ماؤ اتنی دونوں کیلئے تلوار کی شکستی سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔

اگر ہم ان دونوں شکستوں کو دھیان سے دیکھیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ماؤ پریم اور تلوار دونوں کی اصلی طاقت ہمارے دو چاروں، ہماری راجھاؤں اور ہماری اُنگوں پر نہ بھرتی ہے، ہم اپنی سنساری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اور اپنے بھائیوں سے اپنی رکشا کے لئے سوار تھ، فزرت، غصہ، دشمنی اور ایک دوسرے سے ڈاہ کو دُنیا کے بُرے سے بُرے سادھنوں کی مدد سے ایک سنگٹھن اور ایک سنستھا کا رُوپ دے دیتے ہیں۔ اس میں آدمی ہماری فوج اور اُس کے سپاہیوں کا کام دیتے ہیں اور تلوار ہندوئی، توپ، بارود، ایٹم بم ان سپاہیوں کے ہاتھوں میں ہتھیار کا کام دیتے ہیں۔ جو اصلی شکستی اس سنگٹھن کے پیچھے کام کرتی ہے اور جو اسے چلاتی ہے وہ ہمارے دلوں کے اندر کے دہی بھاؤ ہیں جنہیں ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ اس طرح کے بھاؤ جس طرح ہمیں اپنی رکشا کے لئے کام دیتے ہیں اُسی طرح ہمارے ورد دھ کی رکشا کے لئے بھی کام میں آتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بھاؤ دونوں طرف بڑھتے چلے جاتے

ہیں۔ انھیں کے ساتھ ساتھ اُن سادھنوں کا سنگٹھن بھی دونوں طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر ہم کیوں اتنا ہی نہیں کرتے کہ ان سادھنوں کی مدد سے اپنی رکشا کر لیں۔ بلکہ ہم اور آگے بڑھ کر اپنے درودھی سے ادھک سے ادھک فائدہ اٹھانے کی ان سادھنوں کی مدد سے کوشش کرتے ہیں چاہے وہ فائدہ جائز ہو یا ناجائز۔ انت میں یہ شیطانی چکر دونوں طرف سے ظلم زبردستی اور برہادی کا ایک بہت بڑا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح مائو پریم کی شکستی کے پیچھے پریم دیا، چھما، تیاگ، ایک دوسرے کی سیوا، اور ہمدردی کے بھاؤ ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی خود غرضی کا پہلو یا دوسروں سے زبردستی اپنی اپنی پوری کردار کے پہلو نہیں ہوتا۔ ان دونوں باتوں میں یہ شکستی تلوار کی شکستی سے بالکل ایک الگ چیز ہے۔ پھر بھی ایک بات ان دونوں میں ایک سی ہے۔ یہ دونوں آدمی کے دل اور دماغ پر قبضہ پانا چاہتی ہیں۔ پر ان کے قبضہ پانے کے طریقے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ان میں تلوار آدمی کے دل میں اُس کے تن من یا دھن کو کچھ نہ کچھ نقصان پہنچا کر اور اُس میں ڈر پیدا کر کے اپنا مطلب پورا کرتی ہے۔ اس کے خلاف مائو پریم کی شکستی اپنے پریم تیاگ اور سیوا سے لوگوں کے دلوں کو جیتنا چاہتی ہے اور اسی راستے چل کر اپنا مقصد پورا کرتی ہے۔

اگر ہم ان دونوں شکستیوں کے کام اور نتیجوں کو اخلاقی نگاہ سے ہی دیکھیں تو تلوار دوسرے کے دل میں ڈر بیٹھا کر اُسے کسی ایک راستے پر چلنے کے لئے مجبور کرتی ہے چاہے وہ راستہ نیکی کا ہو یا بدی کا۔ اس کے خلاف مائو پریم آدمی کی پوری آزادی قائم رکھتے

ہوئے اُسے اپنی محبت کے جادو اور تیگ کی موہنی سے بس میں کرتا ہے۔ ان دونوں میں اپنے ورد دھمی کو جیتنے اور سدھارنے کی بے انت شکست ہے۔ لیکن تلوار دوسرے کو کم یا زیادہ نقصان پہنچانے سے کبھی بھی پاک نہیں ہو سکتی۔ یا تو یہ کھلے طور پر چھوٹے یا بڑے پیانے پر لوگوں کے جان اور مال کا نقصان پہنچاتی ہے یا کبھی کبھی نقصان پہنچائے بنا ہی اپنے ورد دھمی کے دل میں ڈر اور ہیبت بیٹھا کر اُسے شیک کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ گرد ہوں اور قوموں کی قوموں کے دل میں یہ ڈر بیٹھ جانا اُن کے لئے جان اور مال کے نقصان سے بھی زیادہ بُرا ہوتا ہے۔ یہ اُن کے اندر کے غصے، نفرت اور دشمنی کو نہ ختم کرتا ہے اور نہ کم کرتا ہے۔ کیوں انہیں اس بدگیم نہیں چھوڑتا کہ وہ ہمت کے ساتھ اپنے دل کے ان بھاؤں کو پرکھ کر سکیں۔ اس طرح اندر ہی اندر ان بھاؤں کا نہ ہر اُن میں اور بھی بڑھتا جاتا ہے۔ ہنسنا کی شکست کا یہ بُرا نتیجہ اتنا بنیادی ہے کہ اُس کے ذریعے کوئی سچا سدھار ہو ہی نہیں سکتا۔ سدھار کی جگہ یہ ناکھول انسانوں کے شریروں کا ہی نہیں اُن کی آتماؤں اور ضمیروں کا بھی خون کر دیتی ہے۔

آج کل کے نینک سائنس کے جاننے والے اور من و دیا کے پنڈت اس بات پر سب ایک رائے ہیں کہ کسی طرح کی بھی ہنسنا دباؤ یا سزا کا خیال کسی تعلیمی مقصد یا کسی طرح کے سدھار کو پورا کرنے میں کیوں بے کار ہی نہیں بلکہ اُلٹا نقصان دینے والا ثابت ہوتا ہے۔ آدمی کے اندر کی کمزوریوں اور بُرائیوں کو کم کرنے یا سدھارنے کی جگہ وہ انہیں اور زیادہ گہرا اور ٹیکاؤ بنا دیتا ہے۔

اس اصول کو آج دنیا میں عام پر تعلیم اور سدھار کے پنڈتوں نے ٹھیک مان لیا ہے، اب انسانی دنیا اپنی ساری تعلیمی مستحقوں، سدھار کی کوششوں یہاں تک کہ جیلوں تک میں بھرمیوں کے سدھار کے لئے بالکل نئے نئے طریقے کام میں لاتی جا رہی ہے، جن میں ہنس یا سزا کی بھاؤ نامنتی جا رہی ہے۔ اس انقلاب کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہنس اور زبردستی کے طریقے بند کئے جا دیں اور ان کی جگہ اہنس کے طریقوں سے کام لیا جاوے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہنس یا تلوار سب طرح کے سدھار کے لئے بالکل بے کار ہے۔ جہاں تک مانو پریم کا سبندھ ہے وہ کسی کو کسی طرح کا جان یا مال کا نقصان پہنچا ہی نہیں سکتا۔ وہ دونوں طرف کے دلوں سے ڈر کو بالکل مٹا دیتا ہے۔ ڈر ہی ہر طرح کی ہنس کی جڑ ہے۔ جب آدمی بالکل نڈر ہو جاتا ہے تو اُسے اپنی رکشا کے لئے بھی کسی سنگٹھن کی ضرورت دیکھائی نہیں دیتی۔ اس لیے تلوار کا یہ کام بھی کہ اس سے لوگوں کی رکشا کی جاتی ہے بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ سدھار یا رکشا کے علاوہ تلوار کا ایک کام اور رہ جاتا ہے۔ وہ ہے دوسروں کو جیتنا۔ اول تو انسانی دنیا آج اس گری ہوئی حالت میں بھی اس طرح کے جیتنے کو نا جائز سمجھتی ہے اسلئے ہمارے جیون کے اس پہلو کو جاری رکھنے کا سوال ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ پھر بھی اگر ہم تلوار کے اس پہلو کا مانو پریم کے اسی پہلو سے مقابلہ کریں تو اس بارے میں بھی مانو پریم کا ہتھیار زیادہ اونچا اور کام کا ثابت ہوتا ہے۔ مانو پریم کی شگفتی ہار جیت کا جواب تیاگ سے دیتی ہے۔ اس طرح ہار جیت کی برائیاں بھی

بہت کم ہو جاتی ہیں اور دھیرے دھیرے اُس کے مٹ جانے کی بھی آشا پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ہم تیاگ میں آدمی کو سچا آدمی بنانے کی شکست نہ بھی مانیں تب بھی ہم تیاگ کے فائدے سے انکار نہیں کر سکتے نہ ہم اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ تیاگ کا راستہ صلیح اور سمجھوتے کی راہیں کھلی رکھتا ہے اور کھینچا تانی، مار کاٹ اور دشمنی کی راہوں کو کم کر کے اُن کے مٹنے کی صورتیں پیدا کر دیتا ہے۔

جہاں تک ان دونوں شکستوں کے استعمال میں باہری سادھنوں اور سامان کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تک بھی ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تلوار کے لئے مادی سادھنوں کی بہت بڑے پیمانے پر ضرورت پڑتی ہے جس میں ان گنت دولت خرچ کرنی پڑتی ہے۔ یہ سارے سادھن دُنیا کے بنانے والے نہیں بگاڑنے والے ہیں۔ ان کے جواب کے لئے درودھی کو اسی طرح کے گھاتاک سادھن کام میں لانے پڑتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں مانو پریم کی شکستیں ہمیں رچنا اور سواو لمبن کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ کسی مادی سادھنوں کی محتاج ہے ہی نہیں۔ اس سے بھی اونچی بات اُس میں یہ ہے کہ اُس کا اثر اور جواب اور جواب کا جواب، دونوں طرف سے اور دونوں کے لئے رچنا تک ہوتا ہے۔ اُس سے دونوں کا بندھار ہی بندھار ہوتا ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ تلوار انسانی گتھیوں کو سلجھاتی نہیں، اُنھیں اور بھی الجھا کر کڑا کر دیتی ہے۔ اس کے ہنسنا اور دشمنی کا ایک دور شروع ہو جاتا ہے جسے تلوار کسی طرح ختم کر ہی نہیں سکتی۔ اس دور کو اگر دنیا کی کوئی شکست ختم کر سکتی ہے تو وہ مانو پریم کی ہی شکست ہے۔

ان میں پورے فرق یہ ہے کہ تلوار اپنی کامیابی کے لئے باہر کے سادھنوں کی محتاج ہونے کی وجہ سے اپنے سے زیادہ بڑے اور زیادہ سادھنوں والے سنگٹھن کے سامنے جھک جانے اور ہار مان لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی آتم گو رو یا خود داری کا پہلو ہے ہی نہیں۔ نہ اس میں کوئی سنتوش کا پہلو ہے۔ اس کے لئے اپنا فوجی سنگٹھن ہر ستمے پورا رکھنا اور اُسے برابر بڑھاتے رہنا ضروری ہے۔ جب تک کوئی طاقت دُنیا کی سب سے بڑی طاقت نہ بن جاوے تب تک اُسے یہ کوشش اور تیاری جاری رکھنی ہی ہوگی، کیونکہ اس کے رہنا وہ دوسروں سے اپنے کو بچا کیسے سکے گی۔ دُنیا کی سب سے بڑی طاقت بن جانے کے بعد بھی نئے دشمن پیدا ہونے اور پُرانے دشمنوں کے اس کے خلاف مل جانے کا ڈر ہمیشہ بنا رہے گا۔ تلوار کی یہ آخری بد نصیبی ہے کہ اسے چین اور شانتی کبھی مل ہی نہیں سکتی۔ اس کے خلاف مائو پریم کی شکست اتنا صبر اور شانتی پیدا کرتی ہے کہ جس پر کوئی باہر کی طاقت اپنا اثر نہیں ڈال سکتی۔ باہری دباؤ سے اثر لینے کا ڈر اس میں بہت ہی کم ہوتا ہے۔ اس ڈر سے یہ لگ بھگ آزاد رہتی ہے۔ اس بنگاہ سے اس میں سچائی خود داری ہوتی ہے جسے ساری دُنیا کی مادی طاقتیں بھی مل کر نہیں مٹا سکتیں۔

ہماری ساری پُرانی مذہبی کتابیں اور سنتھائیں مائو پریم کی شکست کو دُنیا کی سب سے بڑی رچنا تک شکست بتاتی ہیں۔ وہ یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ یہ شکست ہنسا کی ہر شکست پر ہمیشہ وجے حاصل کر سکتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ غصہ نفرت اور دشمنی آگ کا جوہر رکھتی ہیں۔

تلوار اسی جوہر کا شکاست روپ ہے۔ اس لئے یہ آگ دوسروں کی آگ بجھا نہیں سکتی اُسے بڑھا اور بھڑکا ہی سکتی ہے۔ مائو پریم کی شکستی اس آگ کے لئے پانی ہے جو قدرتی طور پر اس آگ کو بجھا دے گا یا کم کر دے گا۔

ان دھرم پستکوں نے دستار کے ساتھ وہ سا دھن بتائے ہیں جن سے آدمی اس شکستی کو بڑے سے بڑے پیمانے پر اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔ جس طرح باہر کی سائنس میں دُنیا کے مادی قانونوں کی پھان بین کی جاتی ہے اُسی طرح مائو پریم اور آتم بل کے ان جانکاروں نے تجربے کر کے اس شکستی کے اصلی روپ کا پتہ لگایا ہے اور اس بات کی کھوج بھی کی ہے کہ اس شکستی کے ذریعے انسانی زندگی کی کن کن کمٹائیوں کو کس کس طرح حل کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اس شکستی سے کام لینے کے لئے نیم اور طریقے لکھ دیئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کس کس حالت میں اس شکستی سے کام لینے کے کیا کیا نتیجے ہوں گے۔ اور اُن کے بعد پھر کیا کرنا ہوگا۔

ان کھوجوں اور پریوگوں سے فائدہ اُٹھا کر دُنیا کے بڑے سے بڑے سدا چاری اور روحانی جانکار جیسے رشی، مہنی، نبی، ولی، تیر تھنکر اور ادتار دُنیا کے سامنے آکر اتہاس کے پتوں پر اپنے اچرج بھرے کارنامے بھوڑ گئے ہیں۔ ان کارناموں کو دیکھنے سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ انسانوں پر اپنی حکومت قائم کرنے کیلئے تلوار کی شکستی مائو پریم کی شکستی کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہم اس سوال کی لمبی بحث میں نہ جا کر کیول مختوڑی سی مثالیں نیچے دیتے ہیں۔

دُنیا کے کچھ جان سے جان پرشوں سے جو نیک اور آہنک شکتی کے جانکار تھے جیسے بُدھ، عیسیٰ، محمد، رام، کرشن، زرتشت، بودھی اور اسی طرح کے دوسرے دیوتوں کے بڑے بڑے بزرگوں نے دُنیا میں اپنی اپنی اخلاقی اور روحانی حکومتیں جنھیں ہم دھرم مذہب کہتے ہیں قائم کیں۔ اگر ہم ان حکومتوں کو دیکھیں اور پھر ان حکومتوں کو دیکھیں جو دُنیا کے بادشاہوں اور رکنشاہوں نے قائم کیں تو صاف دکھائی دے جاوے گا کہ یہاں تک شان شوکت، پھیلاؤ اور استبداد کا سمندر ہے، ان دونوں طرح کی حکومتوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔

یہ کہنا کہ ان حکومتوں کے قائم ہونے میں بھی بڑے بڑے پیارے پر تلوار سے کام لیا گیا۔ اگر یہ حق بھی ہو تو، ہماری بات پر اسکا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ اگر ہم یوں دیکھیں تو ہر بادشاہ اور شہنشاہ نے اپنی حکومت بنانے اور بنائے رکھنے میں اس طرح کی مدد ہی سسٹھاؤں سے یا مافو پریم کی شکتی سے کام لیا ہے وہ اتنا اوجھک ہے کہ جس کے سامنے مذہب کا تلوار کی مدد لینا کچھ بھی نہیں رو جاتا۔ اس کے علاوہ اتھاس کی مدد سے یہ ابھی طرح ثابت کیا جاسکتا ہے کہ جس پیارے پر کسی مذہب نے اپنے بچے مطلب کو پورا کرنے میں تلوار سے کام لیا اسی پیارے پر وہ مذہب اپنے اعلیٰ مقصد کو پورا کرنے میں ناکام رہا اور اُس نے اپنی کمزوری اور بربادی کے بیچ بوسے۔

دُنیا کی ایک بڑی بد نصیبی یہ ہے کہ دھرم مذہبوں کے بعد کے آچاریہ اور ماننے والے جیوں جیوں اپنے سچے نیک اور آہنک سوچوں سے دور ہوتے گئے اتنا اتنا ہی وہ باہر کے

سنساری سادھوں کے زیادہ زیادہ محتاج ہوتے چلے گئے، اور ان میں دنیا کی وہ رچتا عین اور وہ برائیاں جنہیں مذہب کم کرنے اور مٹانے آیا تھا بڑھتی چلی گئیں۔ راج کاج کے ہنسنا بھرے مریدانوں سے بھی ان مذہبی سنتھاؤں اور آچاریوں کو تلوار کا پیر لاگ مٹانا چاہئے تھا۔ ان سے آشنا تھی کہ وہ راج کاج کو بھی پوری طرح سدا چاری اور روحانی شکستوں کے ادھین کر سکیں گئے اس سب کی جگہ دھیرے دھیرے یہ مذہبی لوگ خود راج کاج کے ادھین اور فرماں بردار بن گئے اور راج درباروں سے لایہ اٹھانے کی رچتا میں ان کی اتنی بڑھیں کہ انت کو ان میں اور دنیا کے دوسرے لوگوں میں سوائے اوپر کی دکھاوٹی اور نکمٹی باتوں کے کوئی سچا فرق یا کوئی اونچائی نہ رہ گئی۔ اس کا سب سے برا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی دنیا کو ایک بھائی چارے کے سانچے میں ڈھالنے کی جگہ یہ لوگ خود اس بھائی چارے کے پیدا ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹیں اور لوہے کی دیواریں بن کر رہ گئے۔ ان کی اس گر ادھ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی جیون کے راج کاجی اور مالی پہلوؤں کو روحانی اور اخلاقی پہلوؤں پر چھا جانے کا موقع مل گیا۔ ایک طرف روحانیت اور مائے پریم اور دوسری طرف راج کاج اور تلوار یہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف شکستیاں تھیں جن کا ایک جگہ پر مل جانا کھٹن ہی نہیں بلکہ ان ہونی بات تھی۔ تلوار کے سائے میں روحانیت کا آشر یہ لینا اپنی ساری پتی اونچائی اور بھلائی کو ختم کر دینا تھا۔ اس طرح گرتے گرتے جب ان مذہبوں نے اپنے کو قومی اور نسلی ایسے ہی درن اور پیر دلے

کی گردہ بندیوں میں بانٹ لیا اور سچے دین دھرم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈائے تو انسانی بھائی چارے کو علی روپ دینے کے ٹکڑے اور دھار مک دروازے بند ہو گئے۔ اس کے بعد راج کاجی اور دوسرے سماجی نیتاؤں کو اس مقصد کے پورا کرنے کے دوسرے راستے نکالنے پڑے جنہوں نے آج لوک راج، سماج واد (سوشلزم) اور سماج واد (کیونزم) کے روپ لے لئے ہیں۔ آج پڑائے دھرم مذہبوں کے دعوے دار بڑے پیادوں پر انہیں آندولوں کی طرف جھک رہے ہیں۔ انہیں یہ دکھائی نہیں دیتا کہ یہ راستے اُن کے اپنے نیتے کے راستے ہیں۔ یہ سمجھ اُن میں بھی آسکتی تھی جب اُن میں کچھ بھی سچا سدا چار یا روحانیت باقی ہوتی۔ اگر آج بھی وہ اپنی اصلیت کو، اپنے دین دھرم کے سچے روپ کو اور دُنیا کے جھکاؤ کو پوری طرح سمجھ لیں تو یہ دُنیا کی حالت میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دے سکتے ہیں۔ ان کے لئے سیدھا راستہ یہ ہے کہ راج کاج کے زعب میں نہ آکر اور اُس کے پرلو بھوں سے اوپر اُٹھ کر اپنے پڑائے دینوں اور سدا چاری راستوں پر آجائیں اور راج کاج سے باہر رہ کر ایک بڑا اور شاندار نیتک اور آئینک سنگٹھن بنالیں، جس سنگٹھن کا ایک اکیلا مقصد آدمی کو آدمی بنانا اور دُنیا کو راج کاج کی بھولوں اور بُرائیوں سے بچانا ہو۔ اس سنگٹھن کا کام ہوگا راج کاج کو سچے دھرم اور سدا چار کے ادھین کر کے اُس کے ہاتھ سے چننا اور زبردستی کا ہتھیار چھین کر اُسے مافوجانی کا سچا سیوک بنالینا۔ آج کل کے مذہبوں کے آچاریہ اگر یہ کام نہیں کر سکتے تو دُنیا کی

بھلائی کرنے کے بجائے وہ اُس کی اُتھتی کے راستے میں ایک بہت بڑی
وِکاڈٹ ہوں گے جسے دُنیا کسی طرح بھی دیر تک برداشت نہ کرے گی۔

سیوک اور سیوا

دُنیا کی اس طرح کی نازک اور درد ناک حالت میں بالوکا جنم
ہوا۔ اُنہوں نے انتہاس میں پہلی بار مائو پریم کو تلوار کے مقابلہ
میں لاکر کھڑا کر دیا اور وہ بھی راج کالج کے میدان میں۔ اِس
ملاقات کی مدد سے وہ انسانی جیون میں ایک نئی انقلاب پیدا کرنا
چاہتے تھے۔ جو پانچ باتیں کسی بھی انقلاب کے پیدا کرنے کے لئے
ضروری ہوتی ہیں اور جو بالوکا نے اپنے ددھان میں رکھی ہیں اُن
میں سے پہلی (مقصد، سادھن، شگتی) ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔
یہ تھی وہ شگتی ہے جس کے بل پر انقلاب پیدا کیا جاسکتا ہے یعنی
آتم کل اور مائو پریم کی شگتی۔ پانچویں جگہ ہم اُن تلوار تھ، تیاگی
سیوکوں کو دیتے ہیں جو اس شگتی کی مدد سے اُس انقلاب کو پیدا
کر رہے تھے۔ مائو پریم کی شگتی کے بارے میں ہم بہت کچھ کہہ چکے
اب ہم اِس ددھان کے سیوکوں کی بابت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔
جب سے بالوکا اِس شگتی کا اور اپنے شن کا اُلو بھو
ہوا تبھی سے اُنہوں نے اِس طرح کے سیوک پیدا کرنے کی
کوشش شروع کر دی تھی۔ جو اِس شگتی کو اپنے اندر پیدا کر کے
اُس شن کے پورا ہونے میں مدد دیں۔ اُنہوں نے اپنے آئندوں

اور آندولنوں کے ذریعے ایسے بہت سے سیوک ملک میں پیدا کر دیئے ہیں۔ اس دودھان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باپو نے انھیں سیوکوں پر اس نئے آندولن کے چلانے کی ذمہ داری ڈالی ہے اور اس طرح کے سب سیوک اس کام میں لگ سکیں اس لئے باپو نے اپنے سارے رچنا ترک سنگٹھنوں کو "لوک سیوک سنگٹھن" میں مل جانے کو کہا ہے۔ جن سنگٹھنوں کو انھوں نے اس نئے سنگٹھن میں شامل کیا ہے ان کے نام ہم نیچے دیتے ہیں۔ یہ دودھان کی دفعہ دس میں دیئے ہوئے ہیں۔

- ۱۔ کل ہند چرخہ سنگٹھن
- ۲۔ کل ہند گرام اڈورگ سنگٹھن
- ۳۔ ہندوستانی تنلیکی سنگٹھن
- ۴۔ ہر تین سیوک سنگٹھن
- ۵۔ گو سیوا سنگٹھن

دفعہ دس میں اوپر کے مقصد کہہ کر جن مقصدوں کا حوالہ دیا گیا ہے ان سب کو ہم پیچھے دے چکے ہیں۔ جو لوگ اس سیوکوں میں ہونی ضروری ہیں وہ بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ جن رچنا ترک کاموں کو پورا کرنا ان سیوکوں کا فرض بتایا گیا ہے وہ بھی لگ بھگ وہی سب ہیں جنھیں اوپر لکھے پانچ سنگٹھن ملک میں چلا رہے ہیں۔ اس سب سے ظاہر ہے کہ یہ نیا آندولن بھی باپو اپنے پرکھے ہوئے جانکاروں کے ہی سپرد کرنا چاہتے تھے اور چونکہ انھیں اس لازمی پریم کی شکست سے کام لینا تھا جسے وہ ہر طرح کی ہنسائے بچانا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے اپنی بیچائتوں میں ایسے

سیوکوں کے سوائے اور کسی کو کوئی جگہ نہیں دی۔ باپ کی غرض یہ تھی کہ اس نئے آئندہ دن کو ان باتوں سے بچایا جاوے جن کی بدولت کانگریس سیدھے راستے سے بھٹک چکی تھی۔ اکل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے دودھان کی یہ شرطیں پیش کرنے کے صاف معنی یہ تھے کہ کانگریس والے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ ان لوگوں کو جن کا بھٹکاؤ کیوں راج کالج کی طرف ہے اب رچنا تنک پروگرام کے کام کرنے والوں کی رہنمائی میں کام کرنا ہو گا۔ یہ اس حالت کو الٹ دینا تھا جو پچھلے تیس سال تک رہ چکی تھی۔ یہ کانگریس کے کے پچھلے راج کالجی جیون کو مٹا کر اُسے ایک اہنسا تنک رچنا تنک سیوک کی طرح کام کرنے پر مجبور کرنا تھا۔

باپ خود اپنی زندگی میں اس دودھان کو عملی روپ دیتے تو کیا کیا صورتیں پیدا ہوتیں اس کا اچار کرنا اب کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ظاہر ہے کہ کانگریس اس طرح کے انقلاب کو پسند نہیں کر سکتی اس لئے اس آئندہ دن کو چلانے کا سارا بھار اور ذمہ داری ان کام کرنے والوں پر ہے جو باپ کے پڑائے آئندہ دنوں میں کام کر چکے ہیں یا ایسے نئے لوگوں پر ہے جو باپ کے پریمی ہیں۔ ان کے اصولوں کو ماننے ہیں اور اب اس میں عملی حصہ لیکر اس آئندہ دن کو سچل بنانا چاہتے ہیں۔

باپ ہمیشہ اپنے کام کرنے والوں کے سامنے سیوا اور تباگ کا وہ ادب و آدرش رکھتے تھے جو مذہبی ستیا سیدوں اور یوگیوں کے سامنے رہتا ہے۔ دُنیا کے کسی راج کالجی کام کرنے والوں کے سامنے سیوا کا اتنا ادب و آدرش شاید ہی سمجھی رہا ہو۔ ایسے ہی

دنیا کے شاید کم کام کرنے والوں نے اس اونچے آدرش کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنے کی اتنی سچائی سے کوشش کی ہوگی جتنی باپو کے سیوکوں نے۔ پھر بھی کسی آدرش کو پوری طرح اپنے جیون میں ڈال سکتا آدمی کی شکنتی سے باہر ہے۔ باپو اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

اسی لئے وہ بڑے پریم کے ساتھ ہمیشہ اپنے سیوکوں کی بہمت بڑھاتے رہتے تھے۔ اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش میں گئے رہنا اور اپنی طاقت اور بہمت کے انوسار اپنی ذمہ داریوں کو گلن کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کرتے رہنا یہی باپو کی نگاہ میں سچے سیوک کا کام تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری سچائی اور کوشش ہی، اگر ہم گئے رہے تو ہمارے کمزوریوں کو دور کر دے گی اور دھیرے دھیرے ہماری سیوا کے دائرے کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہمارا اثر بھی بڑھتا جائے گا۔ اس اثر کا بڑھنا ہی ہماری سیوا کی سچائی کی کسوٹی ہوگی۔

باپو اپنے سیوکوں کے لئے کوئی قانون حق یا نالی سادھن یا اسی طرح کی باہری سہولتیں جمع کر دینا پسند نہ کرتے تھے۔ وہ ان لوگوں کے سامنے ہمیشہ سوا دلہن کا آدرش رکھتے تھے۔ ماتو پریم سے اور اپنے تیاگ اور سنوارتھ سیوا سے لوگوں کے دلوں کو جیتنا، اپنے سچے، اپنے سادھنوں، اپنی ساری شکنتی اور شردھا کے انمول موتی ماتو سماج کی بھلائی پر قربان کر دینا—یہ ہی بے لاگ سیوا کے سچے جوہر ہیں۔ اسی سے وہ نینک بل یا آتم بل

پیدا ہوتا ہے۔ جو تلوار اور ہنسا سے ٹکڑے لیتا ہے اور جو لوگوں کے دلوں پر اپنا اثر ڈال کر ایک چھوٹے سے سیوک کو اُن کا پیارا بنا دیتا ہے۔ مادی شکتی اور بے لاگ سیوا دونوں اپنی اپنی حکومتیں قائم کرتی ہیں۔ ایک لوگوں کے جان اور مال پر قابو پا کر، اور دوسری اُن کے دل اور دماغ پر اپنی محبت اور سیوا کا سکہ بٹا کر، ایک خراج یا ٹیکس لیتی ہے، دوسری اپنا سب کچھ دے دیتی ہے۔ تلوار چار دان بیتی ہے، تن، دھن، جان اور ہمت۔ مانو پریم چار دان دیتا ہے۔ دھن، تندرستی، وزیا اور بڈرنا۔ یہی چار دان باپو نے اپنی سنگر سیوا کی دنداؤں میں شامل کئے ہیں۔ انھیں چار دانوں سے تلوار اور راج کالج کی سب سے بڑی سے بڑی طاقتوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ تلوار ایک ڈراؤنی چیز ہے۔ مانو پریم اور سیوا ایک موہنی شکتی ہے جیسے دیپک میں پروانے کیلئے اور چند ماہ میں چکور کے لئے ہوتی ہے۔ یہ شکتی سیوک کے تیاگ کا اثر جتنا کہے دل میں ڈال کر اُسے تلوار کے ڈر اور حکومت کی ہنسا و دلاں سے بڈر اور آزاد کر دیتی ہے اور اُس کے من کی طاقت کو فراموشی بنا دیتی ہے۔ تیاگ کی وہ شکتی جو سیوک میں ہوتی ہے اور جس میں مانو پریم کی موہنی گھٹی ہوئی ہے لوگوں کے دلوں میں گھس کر انھیں مالا مال کر دیتی ہے۔ تیاگ اُن کے لئے ایک فرض ہی نہیں بلکہ اندر کی شائستگی، سنتوش اور آئندہ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ باپو اپنے سیوکوں میں یہی سیوا کی شکتی اور یہی مانو پریم

پیدا کر دینا چاہتے تھے۔ اس سب کے بدلے میں باپو ایک ہی گرد و کشتا مانگتے تھے۔ وہ یہ کہ سیوک اپنا راج جمانے میں اس شکتی کے سیوا دیا کی کسی دوسری شکتی سے کوئی سہارا نہ لیں۔ سیوکوں کے جیون میں یہ اُسی اسوا دلبن کا چتر ہے جو باپو کو اتنا پیارا تھا اور جسے وہ ساری شکہ شانتی اور شکتی کا سوتا بتاتے تھے۔ اس ددھان میں اُنھوں نے جن شبدوں میں یہ گرد و کشتا مانگی ہے وہ ہم نیچے دیتے ہیں۔ ”یہ بات دھیان میں رکھنی چاہئے کہ سیوکوں کی اس جماعت کو جو کچھ ادھیکار ہوں گے یا جو کچھ شکتی اُنھیں ملے گی وہ اُس سیوا سے ملے گی جو اپنے مالک یعنی سارے ہندستان کی پورے دل سے خوشی خوشی اور سمجھداری کے ساتھ کریں گے۔“

یہی باپو کا گاتیری منتر ہے۔ سنوار تھ سیوا کا یہی روپ ہے۔ لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے یہی چمک شکتی ہے۔ تلوار کو قابو میں کرنے کا یہی دشیکرن منتر (توید جب) ہے اور نیتک انقلاب کے لئے یہی رام بان یا اسم اعظم ہے۔ باپو کا سیوا کو اپنے ددھان میں یہ شاندار جگہ دینا، اُن کے سگر سیوا کے پرد گرام کو اُس برہم گیہ یا یزدانی گیہ کی شکل دے دیتا ہے جس میں گیتا کے اوسار سارے سنسار کی سرشٹی ہوئی ہے۔ گیتا کا یہ اُپدیش سنوار تھ سیوا اور تیآگ کو ہی قدرت کے سارے قانولوں کی دھری بتاتا ہے۔ اس تیآگ میں جتہ لینا سب پرائیوں کا فرض ہے۔ یہی قدرت کا ریم اور تقاضہ ہے۔ کوئی جاندار یا بیجان اس

قانون کے دائرے سے باہر نہیں جاسکتا۔ اگر وہ اس سچائی کو سمجھ کر خوشی خوشی اور پورے دل سے اُس میں حصہ لیتا ہے تو اُس سے دُنیا کو اور دُنیا سے اُس کو بے حد فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس دھرم کے راستے سے، اس راہِ مستقیم سے بھٹکتا ہے تو وہ قدرت کی نعمتوں سے دور ہٹ کر دُنیا کے دکھوں اور مصیبتوں میں پھنس جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس قانون سے انجان ہو اور اپنے سنساری دکھ کے اصلی کاروں کو نہ سمجھ پاتا ہو پر اس سے وہ اس قانون کے نتیجوں سے بچ نہیں سکتا، اگر وہ سمجھ کر بھی اپنے اس فرض کو پورا نہیں کرتا، تو اُسے اپنی اس بھاری بھول کا خمیازہ بھوگنا پڑے گا۔

اسی قانون پر ہندستان کی پرانی سمیٹا کی ساری تعمیر ہوئی تھی۔ اس لئے اُس سمیٹا نے دُنیا میں اتنی اونچائی اور کامرانی حاصل کی پر اُس سمیٹا کے نام یوا تیاگ کے اس اونچے آدرش پر پورے نہ اُتر سکے۔ اسی سے ہمارا دیش بربادی کے بھنور میں پھنس گیا ہے۔ باپو ہمیں اس بھنور سے نکلنے کا راستہ بتانے آئے تھے۔ ہم اسے مانیں یا نہ مانیں پر قدرت اور دُنیا کی حالت دونوں یہ بتا رہی ہیں کہ ہمارے اور دُنیا کیلئے کوئی دوسرا راستہ ہے ہی نہیں۔

باپو خود تیاگ اور مافہ پریم کی پورٹی تھے۔ اُنہوں نے ہنوار تھ سیوا کی ایک باڑھ اس دیش میں پیدا کر دی تھی۔ اُن کے لئے مافہ پریم ویسی ہی اصلی اور سچی خشکی تھی جیسی بجلی یا ایڑمیک انرجی سائنس دانوں کے لئے۔ اُن کا خیال

تھا کہ ہر آدمی یہ شکتی اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے اور اُسے جتنا چاہے بڑھا سکتا ہے۔ پر کرتی کے نیہوں میں اس شکتی کے بڑھنے کے لئے کوئی حد یا سیما نہیں ہے۔ نہ کوئی باہری رکاوٹ ہمیں اس شکتی کے اپنے اندر بڑھانے میں ٹھنائی پیدا کر سکتی ہے۔ رکاوٹیں جو ہیں وہ ہماری اپنی پیدا کی ہوئی ہیں۔ منشیہ نے اپنی غلطیوں سے ہی اپنے آپ کو برباد کیا ہے۔ جتنی کوشش، محنت اور دولت خرچ کر کے ہم نے اپنے تلواری سنگھن کو بنایا ہے اور اُسے بڑھانے میں جتنی کوشش، محنت اور دولت ہم خرچ کرتے رہتے ہیں اُس کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی اگر ہم مانڈ پریم کی شکتی کو اپنے اندر پیدا کرنے اور بڑھانے میں خرچ کریں تو انسانی قوم کی ساری مصیبتیں دَم کے دَم میں ختم ہو سکتی ہیں۔ جتنا اور راج دونوں مل کر اس کام کو کرنا چاہیں تو لوک راج اور انسانی بھائی چارا دونوں کا سچا دور اس بھومی پر دو دن کے اندر قائم ہو سکتا ہے۔ اسی ادھار پر باپو نے یہ کہا تھا کہ اگر راج کی باگ میرے ہاتھ میں آجادیے تو میں بنا فوج اور بنا پولیس کی مدد کے اسے چلا سکتا ہوں۔

باپو کوئی جادوگر نہیں تھے۔ انھوں نے یہ بات اسی طرح سوچ سمجھ کر اور حساب لگا کر کہی تھی جس طرح ایک سائنس والا سائنس کی بات کرتا ہے یا حساب جاننے والا حساب کے کسی سوال کا جواب بتاتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ راج

اگر اپنی غلطیوں اور بھولوں سے باز آجادیے اور خود مافوق پریم کے آدھار پر اپنے کو چلانے لگے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سارے دیش کے دلوں کو مافوق پریم سے اپنے بس میں کر سکتا ہے اور دیش بھر میں اس طرح کے نئے سنگٹھن کھڑے کر سکتا ہے جو وردھی شکیتوں کے مقابلے کے لئے تلوار سے کئی گنا زیادہ کام کے ثابت ہوں۔ نفرتیں اور عصبانیتیں دوسرے کی کھینچا تانی میٹ سکتی ہے اور ملک کے کونے کونے میں ایک نئی جان، نیا جوش اور نئی طرح کا آتم بل پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ ناممکن باتیں نہیں تھیں اس میں کیونکہ جنتا اور راج دلوں کے سہہ یوگ کی ضرورت تھی۔ باپو کو دشواں تھا کہ اگر راج اُن کا ساتھ دے دے تو جنتا پورا پورا سہہ یوگ دینے سے انکار نہیں کر سکتی۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باپو خود راج یا بادشاہ یا وزیر یا اس طرح کی کوئی چیز بننا چاہتے تھے، وہ کیول حکومت سے اور کانگریس سے دلی سہہ یوگ کی بھیک مانگ رہے تھے۔ جنتا پر تو انھیں بھروسہ تھا ہی۔ اُن کا دُکھ اور اُن کی بے بسی اسی میں تھی کہ کانگریس اور راج سے انھیں یہ سہہ یوگ نہ مل سکا۔

بنا فوج اور بنا پولیس کے راج چلانے کے لئے دو باتیں درکار ہیں۔ ایک دیش کو دوسرے دیشوں کے حملوں اور چالوں سے بچانا، دوسرے دیش کے اندر امن امان قائم رکھنا۔

ان میں پہلی بار باپو نے انگریزی راج کی بنیادوں کو ہلا کر دیش کو خود آزاد کر کے دکھا دیا۔ یہ ایسی حالت میں جب کہ دیش

کے پاس ہتھیار نہ تھے اور دیش ودیشی راج کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اب دیش آزاد ہے۔ وہ اپنی شکتی کو سمجھ چکا ہے۔ یہ کہنا کہ اس بدلی ہوئی ہوا میں باپو اپنے مانڈ پریم کی شکتی اور اہنسا کے سادھنوں سے ودیشی طاقتوں کی چالوں سے ملک کو نہ بچا سکتے تھے، بالکل زبردستی ہے۔ کوئی آدمی جو تھوڑا بہت بھی انصاف اور سمجھ سے کام لے اس طرح کی بات نہیں کہہ سکتا۔

جہاں تک دیش کے اندر پنا فوج اور پولیس کے امن امان قائم رکھنے کا سوال ہے وہاں تک باپو نے راج کالج سے بھی بڑھ کر ثبوت مانڈ پریم کی شکتی اور آتم بل کے کارناموں کے دیئے ہیں۔ باپو کے جیون کے آخری دنوں کے چمنکار، اس سے جب کہ سامپردایک طوفان اپنی چوٹی پر تھا، دُنیا کے کسی بھی آدمی کو پریم کی شکتی اور آتم بل میں وشواس دلانے کیلئے کافی ہے۔ ہمارے پیچھی اُستادوں نے ہمیں دُنیا کا یہ ایک بُنیادی اُصول سمھایا ہے کہ کوئی کام پنا کارن کے نہیں ہوتا۔ مانی ہوئی بات ہے کہ نفرت، غصہ اور ہنسنا شکتیاں ہیں اور یہی وہ شکتیاں ہیں جو آدمی کو حیوانی اور غونی حرکتیں کرنے مجبور کرتی ہیں۔ تلوار ان شکتیوں کو لوگوں کے دلوں میں ڈر بیٹھا کر دبا سکتی ہے۔ سدا چار کے پنڈتوں کا دعویٰ ہے کہ یہ شکتیاں مانڈ پریم کی شکتی سے بھی دبائی جاسکتی ہیں۔ جہاں تک اُن سامپردایک طوٹاؤں کا سمبندھ ہے جو باپو کے آخری جیون میں دیش کے بنوڑے سے پیدا ہوئے وہاں تک

ہم سب جانتے ہیں کہ حکومت کی پولیس اور فوجیں ان طوفانوں کو دبانے میں ناکام ثابت ہو رہی تھیں۔ باپو اس سنگٹ کے سے اپنے دشوار سے کام لے کر اس طوفان کو اپنے ہتھیاروں سے دبانے کے لئے نکل پڑے۔ لڑاکھالی میں وہ پولیس اور فوج کے بجائے شہقی بھرہتھے مردوں اور عورتوں کو اپنے ساتھ لیکر چلے گئے۔ انھوں نے وہاں کے لوگوں کی ان کے گھروں پر جا کر سیوارتھ سیوا کی۔ ان لوگوں میں بہکے ہوئے اور خون کے پیاسے انسان اور سبھے اور دبے ہوئے مظلوم دولوں شامل تھے۔ باپو دولوں سے ملے۔ انھوں نے دولوں کی سیوا کی۔ دولوں کی مدد کی۔ دولوں کے دلوں کو کھلا یا اور بدلا۔ تھوڑے ہی دولوں میں ان کے ماتو پریم کی شکتی نے وہاں کی ہوا پر اتنا اثر ڈالا کہ جتنا کوئی دوسری شکتی نہ ڈال سکتی تھی۔ باپو کے اس اثر کو دیکھ کر دیش کے بڑے سے بڑے لوگوں نے باپو کی نیتک شکتی اور آتم بل کا ستر مانا۔

باپو کے اس اثر کو اگر ہم ایک سائنس والے کی طرح دیکھیں اور سمجھیں تو اس کا یہی مطلب ہے کہ باپو کی نیتک اور آتمک شکتیوں نے وہاں کے مسلمانوں کے غلط جوش اور ہندوؤں کے ڈر دولوں پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ یہ دولوں ایک بہت بڑے پیمانے پر ٹھنڈے ہو گئے۔ غلط جوش، پریم اور پشمانی میں اور ڈر، ہمت اور دھیرج میں بدل گئے۔ اس سے ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے وہ یہ کہ نیتک سائنس کے جاننے والوں کا جو دعویٰ ماتو پریم اور آتم بل کی شکتی کے بارے میں ہے وہ

غلط نہیں ہے۔

اس کے بعد دوسری گھٹنا ہمیں بہار کی ملتی ہے۔ بہار کے ظلموں سے باپو کی بے چینی اور اُن کا دکھ اتنا بڑھ گیا تھا کہ اُنہوں نے نواکھالی ہی سے بہار کے لوگوں کو یہ سندیش بھیجا کہ اگر تم لوگ اپنے ان ظلموں سے باز نہ آؤ گے تو میں لاچار ہو کر اپنی جان دے دوں گا۔ اس سے بڑھ کر پریم اور دردبھرا دوسرا سندیش نہیں ہو سکتا۔ دُنیا جانتی ہے کہ بہار کے لوگوں پر اس سندیش کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ دُنیا کی کسی دوسری شکتی کا نہ ہو سکتا تھا۔ بہار والوں کے دلوں میں باپو کا جو پریم اور آدر تھا اُس کا ایک کارن وہ سیوا تھی جو باپو نے ہندستان کی اور خاص کر بہار کی کی تھی۔ بہار کی وہ گھٹنا نواکھالی سے بھی بڑھ کر مافو پریم کی شکتی کو ثابت کرتی ہے۔ بہار کی گھٹنا ثابت کرتی ہے کہ سیکڑوں میل کی دوری پر آتم بل کی شکتی لاکھوں آدمیوں کے دل کو ایک بارگی بدل سکتی ہے۔ یہ نتیجے پلوئیس، فوج یا کوئی بھی ہنساکا سادھن پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مافو پریم کی شکتی تلوار کی شکتی سے کہیں بڑھ کر ہے۔

یہی صورتیں کلکتے اور دتی میں دکھائی دیں۔ سب جگہ اس ایک ہی طرح کی گھٹناؤں سے نینک سائٹس کے جاننے والوں کا دعویٰ سچا ثابت ہوتا ہے۔ ان ساری گھٹناؤں کو ہم جادو یا کرامات کہہ کر نہیں ٹال سکتے۔

خاص خاص جگہوں پر باپو کا جو اس طرح اثر پڑا اس کے علاوہ سارے دیش پر جو اُنہوں نے اثر ڈالا وہ بھی ہمارے سامنے

ہے۔ ساری دُنیا اس بات کو مانتی ہے کہ سامپردایک طوفان نے جو حالت اُس سے پیدا کر رکھی تھی اُسے باپو کی موت کے ہوا کوئی دوسری شکلی بدل نہ سکتی تھی۔ راج کی فوجیں اور پولیس اور دوسری ساری کوششیں بیکار ثابت ہو چکی تھیں۔ ڈر تھا کہ اگر یہ طوفان اور بڑھا تو سارا ملک اس میں پڑ کر برباد ہو جاوے گا۔ اس سب کے بعد بھی اگر کسی کو مانو پریم اور آتم بل کی شکلی میں دُشواں نہ ہو تو کمی اس میں اُس آدمی کی سمجھ کی ہے۔

دیش کا ہر آدمی اس بات کو مانتا ہے کہ اگر باپو اپنے آپ کو قربان نہ کرتے تو دیش، کانگریس اور راج سب کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ پھر جب مانو پریم ایسی طوفانی حالت میں دیش کو اس طرح بچا سکتا ہے تو اگر اسی شکلی کے بڑے سے بڑے پیانے پر دیش کے کونے کونے میں سنگٹھن پیدا کر دیئے جاویں تو کیا یہ سنگٹھن دیش میں امن امان قائم نہیں رکھ سکتے؟ اگر ایک مہان تیاگی اکیلا کروڑوں آدمیوں کے شیطانی بھادوں کو ایسے جوش یا پاگل پن کے دونوں میں انسانیت کے بھادوں میں بدل دے سکتا ہو تو کیا لاکھوں آدمی مل کر کامیابی کے ساتھ ملک میں امن امان بنائے نہ رکھ سکیں گے؟ ضرورت کیوں اس بات کی ہے کہ اُن لاکھوں آدمیوں کو اپنے اندر مانو پریم پیدا کرنے اور اُسے کام میں لانے کی تسلیم ٹھیک اُسی طرح اور اُسی پیانے پر دی جائے جس طرح اور جس پیانے پر ہنساکے سپاہیوں کو تلوار چلانے اور خون بہانے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہر آدمی کے اندر انسانیت اور حیوانیت دونوں موجود ہیں۔

جس طرح ہم اپنے اسکولوں اور اپنی ساری زندگی میں جانے اور
 اُن جانے اتنے بڑے پیمانے پر حیوانیت پیدا کر سکتے ہیں تو
 کیا ہم انہیں اسکولوں کی تعلیم کے ڈھنگ کو جڑ سے بدل کر اور
 اُسی طرح اپنے جیون کے حیوانی پہلوؤں کی جگہ انسانی پہلو قائم
 کر کے انسانیت پیدا نہیں کر سکتے ؟

ان سوالوں کے جواب میں ایک ہی بات کہی جاتی ہے۔
 وہ یہ کہ باپو مہاتما تھے۔ تو کیا مہاتما آدمی نہیں ہوتا؟ کیا وہ
 دیوتا یا فرشتہ ہوتا ہے؟ پر ہمارا سوال تو اُن پر پڑھے لکھے لوگوں
 سے ہے جو سائنس کے طریقے سے سوچتے ہیں اور جو دیوتا فرشتے
 کیا ایشور تک کو نہیں مانتے۔ جب آدمی کے سوائے اور اُس سے
 بڑھکر اور کوئی ہے ہی نہیں تو باپو کیوں ایک آدمی تھے۔ سوال یہ ہے
 کہ اُس آدمی میں یہ شکتی کہاں سے آئی؟ ظاہر ہے کہ یہ اس کی تعلیم
 اور تربیت سے ہی پیدا ہوئی ہوگی۔ کیونکہ اور کوئی صورت تو
 اس کے پیدا ہونے کی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ہر
 دھرم مذہب کی خاص خاص کتابیں ایک سور سے اس شکتی کی چرچا
 کرتی ہیں اور اس کے پیدا کرنے اور کام میں لانے کے ڈھنگ بتاتی ہیں۔
 کیا وہ سب غلط اور بے بنیاد ہیں؟ باپو خود کہتے تھے کہ انہیں اس شکتی
 کا پتہ اور اس کے بڑھانے اور کام میں لانے کے طریقے انہیں دھرم
 پستکوں سے معلوم ہوئے اور انہیں دھرم پستکوں کے بتائے ہوئے
 راستوں پر چل کر اُنھوں نے اس شکتی کو اپنے اندر پیدا کیا اور اتنا
 بڑھایا۔ تو کیا باپو یہ سب باتیں دنیا کو بہکانے اور دھوکہ دینے کو
 کہا کرتے تھے؟ آخر اس بہکانے سے انہیں کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟

اور اگر ان کی یہ سب باتیں سچ تھیں تو کیا ہیں ان سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔

یہ کہنا کہ ہر ایک باپو نہیں ہو سکتا، اول تو دیکھنا کہ نگاہ سے بالکل بے معنی ہے، دوسرے اگر ہم یہ مان بھی لیں تو کیا ہم سب پھوٹے پھوٹے ہزاروں گاندھی نہیں بن سکتے؟ اور کیا ان سب ہزاروں گاندھیوں کی ملی ہوئی کوشش ہمارے مطالب کیلئے کافی نہ ہو جائے گی۔ کیا اور گاندھی پیدا کرنے میں اتنی کٹھنائی اسی لئے نہیں ہے کہ دنیا اپنی ساری شکتی ہٹلر، سولینی اور اسٹیلن پیدا کرنے میں خرچ کر رہی ہے؟ دنیا نے اپنے سارے ریت رواج، قاعدے قانون، کھیل بتائے، اسکول کالج اور جیون کے سب کار بار انھیں اصولوں پر قائم کر رکھے ہیں جن سے ہٹلر اور سولینی پیدا ہوتے ہیں۔ کیا ان سب چیزوں، مستحکاؤں اور ان کے بنیادی اصولوں کا بدل دینا ناممکن ہے؟ اور کیا مانف بدم کے ان چمٹکاروں اور نیتوں کو دیکھتے ہوئے بھی ہمیں اس طرف علی قدم نہیں بڑھانا چاہئے؟

ہمارا خیال ہے کہ کانگریس اور حکومت کو باپو کے جیون اور ان کی قربانی کو اس طرح بھٹکانا نہیں چاہئے، انھیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ پچھلی تہذیب نے ہمارے سارے پڑھے لکھے لوگوں پر ایک گہرا اور خاص اثر ڈال رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک کے کیا بھرتی اور کیا دوسرے ملکوں سے تعلق رکھنے والے باہری معاملے بہت

زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ ان پیچیدگیوں نے ہماری زندگی کے ہر پہلو کو ہی راج کا جی بھنوروں میں پھنسا دیا ہے۔ ان سب سے نکل سکنے کی کوئی صورت آسانی سے دکھلائی نہیں پڑتی ہے۔ ان طرح ہمارے پڑھے لکھے اور راج کالج میں لگے ہوئے لوگ اپنی آنکھوں میں بڑی طرح ڈوب گئے ہیں۔ مگر مصیبت کچھ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ ہماری اپنی پڑائی سمجھنا کا سارا جھکاؤ راج یعنی سے پڑے تھا۔ اُس کا زور اسی پر تھا کہ عام لوگ راج کالج کو نظر انداز کریں اور اس سے الگ رہ کر اپنا کام سمجھالیں۔ ان سب باتوں نے باپو کی زندگی سے پورا فائدہ اٹھانے کے راستے میں گہری دُشواریاں پیدا کر دی ہیں۔

اس کے علاوہ ایک دُشواری اور بھی ہے۔ باپو ایک سپورٹ یا مکمل آدمی تھے۔ اُن کی زندگی میں سب ہی پہلو اور نشان — چاہے وہ سماجی ہوں یا راج کا جی، چاہے اخلاقی اور چاہے آئتمک یا روحانی — اپنی ادنیٰ اور بلندی پر موجود رہتے تھے، اور ایک ہی وقت میں ایک ساتھ موجود رہتے تھے۔ ان سب میں ایک الٹکا توازن یا سمتول رہتا تھا۔ باپو کا کام کرنے کا ڈھنگ کچھ ایسا نہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی پہلو کبھی نظر انداز نہیں ہوتا تھا۔ مگر اُن کے پریمیوں اور پیروکاروں میں یہ سمتول پیدا نہ ہو سکا۔ اس لئے وہ ان پہلوؤں میں سے کسی ایک ہی ترقی اور سدھار کو اپنا مقصد اور فرض بنا لینے پر مجبور ہوئے رہے۔ زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے ان کا کوئی تعلق ہی باقی نہ رہا۔ نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کی ایکائی کی جو تصویر باپو کے سامنے تھی،

ان میں پیدا نہ ہوئی۔ اسی وجہ سے کسی ایک مرکز پر پوری طرح سے جم سکتا اور مل کر اس پر جُٹ جانا ان کے لئے ناممکن ہو گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ باپو نے اپنی زندگی کے الگ الگ پہلوؤں میں ایک ایسا گھڑا ملا اور مکمل سمٹول پیدا کر لیا تھا جس کی مثال دُنیا کے اتھاس میں ملنا مشکل ہے۔ اُن کے سامنے انسانی زندگی ایک اکائی تھی جس کی ایک سوچی ہستی ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر ہم اُس کے فکر سے کر دیں گے تو اس کی اصلیت کو اور اس کے سوبھاؤ کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ اور نہ ہم اُس سے پورا فائدہ ہی اُٹھا پائیں گے۔ ہمارے جسم کی طرح زندگی بھی ایک مکمل ہستی ہے جس میں روح یا جان ہے۔ اس کے ہر حصے کا ایک دوسرے کے ساتھ دیا ہی نام ہے جیسا ہارٹس میں یا خون اور بدن میں ہوتا ہے۔ نیکن یا اخلاقیات اور ادھیان تکنا یعنی روحانیت کو انسانی زندگی میں باپو وہی جگہ دیتے تھے جو بدن میں دماغ اور بڑھ کی پڑی کی ہے۔ اس لئے زندگی کے کسی پہلو سے بھی ناتا الگ کر دینے کی کوشش کرنا یا اس کے کسی ایک خاص پہلو پر ہی اپنا سارا دھیان و طاقت لگا دینے کا نتیجہ اُن کی رائے میں یہ ہو گا کہ ہم اپنی بڑھوت کے اصل راستے سے بھٹک جائیں گے۔

یہ باپو کسی بنیادی تعلیم تھی۔ لیکن ہم اس تعلیم سے پورا فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باپو کے پیروؤں میں سے وہ لوگ جنہوں نے روحانیت کو اپنا مقصد بنایا، سماجی اور راج کاجی جھینٹوں سے ایک دم الگ ہو گئے۔ اُنھوں نے اپنے سامنے زندگی

کا ایک ہی مقصد رکھتا آدھیانمک ترقی۔

باپو اس دُنیا اور اُس دُنیا میں کوئی بھید نہیں کرتے تھے۔ اُن کے سامنے زندگی اور موت الگ الگ چیزیں نہیں تھیں۔ وہ زندگی اور موت کو ہی نہیں بلکہ کل سرشتی کو وحدت (ایکتا) کا ایک ایسا سموچا اور سچا سرورپ مانتے تھے کہ جس میں پہچلے یا اگلے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اُن کے خیال میں اس وحدت کا ایک مکمل وجود ہے جو نہ بانٹا جاسکتا ہے اور نہ جسکی کوئی حد ہے اور نہ جو مارا یا مٹایا ہی جاسکتا ہے۔ اُن کو یہ بھی دشواری تھی کہ اس سنسار بیانی اور امر سرورپ کے اندر انسان کی بھلائی اور ترقی کا چاہے وہ دین کی ہو یا دُنیا کی، ایک ہی راستہ ہے۔ — تیگ، سیوا اور پریم۔ گیان، بھکشی اور کرم یوگ باپو کے لئے اکھنڈ تھے۔ اس لئے زندگی کی کشمکش سے دور بھاگنا چاہے وہ روحانی مقصدوں کے حاصل کرنے کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ باپو کی سیدھی راہ سے بھٹک جاتا تھا۔

اسی طرح باپو کے پیروپیوں کا ایک دوسرا گروہ تھا جس نے رچنا نمک پروگرام کو چلانا اپنا مقصد بنا لیا۔ وہ بھی اصلی راج نیتی کے دائرے سے باہر ہو گیا۔ اس گروہ کیلئے باپو یہ چاہتے تھے کہ یہ راج کاجی زندگی کی اسپیگ والی جعبھٹوں اور اخلاقی گراوٹوں سے الگ رہے، اس سے اُن کا یہ منشا تھا کہ یہ حصہ اُن کے آئندہ دلوں کی نیک یا اخلاقی سطحوں کو ادنیٰ رکھنے کا فرض ادا کر سکے گی۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے رچنا نمک کام کو اصلی راج نیتی کے دائرے سے باہر سمجھ لیا۔ حکومت کے سیدھے سردھار

کی کوشش کرنا یا اس کی یالیسیوں کو اپنے اصولوں اور قاعدوں کے مطابق پابند بنانے کے لئے اُسے مجبور کرنا۔ ان کے خیال میں رچا تک کام کا کوئی اعلیٰ حصہ نہیں تھا۔ ان کے اس خیال نے، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، رچا تک پروگراموں کو نیرس اور بچان کر دیا۔

جب تک باپو زندہ تھے اور پردیسی سرکار سے لڑائی جاری تھی ہماری اس نا سمجھی کے خطرناک نتیجے صاف صاف سامنے آسکے۔ لیکن ہماری آج کی حالت صاف بتاتی ہے کہ ہم باپو کے اصلی اصولوں اور مقصدوں سے کتنے دور ہو گئے ہیں۔ باپو اپنے دیوبارک بیٹوں میں تو سر سے پاؤں تک راج نہتی کی لڑائیوں میں یا ان کی تیاریوں میں ڈوبے رہتے تھے۔ جب تک دہشی راج قائم تھا باپو کا کہنا تھا کہ میں اپنی زندگی کا ایک ایک چھن اس حکومت سے رٹنے میں یا رٹنے کی تیاری میں خرچ کرتا رہتا ہوں کیونکہ جنگ ملک کو آزادی نہ ملے میرے لئے زندگی اور یہ جنگ دونوں ایک ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی میں ایک چھن کے لئے نظر انداز نہیں کرتا۔ یہ ضرور ہے کہ ضرورت کے لحاظ سے میرے پروگراموں کے روپ بدلتے رہتے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مرتے دم تک ان کی یہ جنگ برابر جاری رہی۔ ان کی آخری وصیت اس بات کا ثبوت ہے۔ اس کی پرستادہائیں انہوں نے کہا ہے کہ اب تک ملک کو اصلی آزادی کسی معنی میں بھی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اور اس کی خاطر ہیں اپنی جنگ کو برابر جاری رکھنا ہے۔

باپ کا کہنا تھا کہ اگر کوئی میرے اصولوں اور کام کرنے کے ڈھنگوں کو پوری طرح سمجھنا چاہے تو وہ میری باتوں پر نہیں بلکہ میرے کاموں پر دھیان دے۔ اگر وہ انہیں پوری طرح سمجھ لے گا تو میری زندگی کا سارا گڑ اُس کی سمجھ میں آ جائیگا۔ پھر اگر ہم باپ کی زندگی میں سے اُس کا راج نیتی سے تعلق رکھنے والا حصہ نکال دیں تو وہ بے جان سی رہ جاتی ہے اور ادھوری تو ہو ہی جاتی ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ باپ خود راج نیتی سے بہت دور ادبچے اور پیچھے ہوئے تھے۔ اُن کا سر ہمیشہ آکاش کی ادنیائیوں سے ٹکریں لیتا تھا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اُن کے پیر دھرتی پر ایسے خے رہتے تھے کہ دیو ہارکتا یا علمیت (PRACTICALISM) و استوکتا یا اصلیت (REALISM)

اور بھوتکتا یا مادیت (MATIRIALISM) کے بڑے سے بڑے بیجاری اُن کے سامنے ہمیشہ جھکتے رہتے تھے۔ اُن کے جیون کے راج کاجی پہلوؤں کو اوجھل کرنا ایک سموچی، سُندرا، او امٹ تصویر کو بگاڑ دینا اور اُجاڑ دینا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کسی انسان کے جسم سے گوشت، پوست، رگ پٹھے سب نکال کر اُس کی ہڈیوں کے پیچھر کو اپنے سامنے دکھائیں اصلی چیز سمجھ لیں۔ باپ راشٹر کے سدھارک اور ہر انسان کے سیوک تھے۔ دُنیا کی حالت اس وقت ایسی ہو گئی ہے کہ ہمارے اصلی جیون کی سچی اصلاح بنا راج کاجی سدھارکے نہیں ہو سکتی۔ اگر باپ راج کاجی سدھار کو اپنا خاص مقصد نہ بناتے تو اس سے اُنکے سارے مشن کا ہی خاتمہ ہو جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ باپ کے جیون کے

اس پہلو کو ہم نے وہ جگہ ہی نہ دی جو اُسے ملنی چاہیے تھی۔
اس لئے ہم باپ کے رچنا تک پروگرام کے اصلی مقصد سے بہت دور ہو گئے ہیں۔

مگر اس سے بھی زیادہ بد نصیبی کی بات ایک اور ہو گئی۔
وہ یہ کہ باپ کے ساتھیوں کا تیسرا دل جو راج نیتی میں گیا اور
جس کی تعداد دوسرے دلوں سے بہت ہی زیادہ تھی، اُس دل
نے باپ کی تعلیموں اور طریقوں کو دل سے سو بیکار نہیں کیا۔ پچھم کا
اس کے اوپر اتنا گہرا اور اُٹھ اثر تھا کہ باپ کی کوشش سے
وہ دُٹ نہ سکا۔ راج کاجی کامیابی پانے اور طاقت ملنے کے
ساتھ ساتھ یہ اثر اور بھی گہرا رنگ پکڑتا گیا۔ باپ کی موت کے
وقت تک یہ حالت بدل نہ سکی۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے
دیش کا راج کاجی روپ رنگ کچھ ایسا ہو رہا ہے مالاں دیش
میں باپ کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ
باپ کی زندگی کا بہترین حصہ اس گروہ کو ملک پر دجی بنانے
کی کوشش میں ختم ہوا تھا۔ ایک لمبے عرصے تک اپنے مقصدوں
کو حاصل کرنے کی اُن کی ساری امیدیں اسی گروہ کے ساتھ گھلی
مٹی رہی تھیں۔ اور یہی نہیں بلکہ اپنے انھیں پریمیوں کو پیچھے
رکھ کر باپ اپنے آپ کو ہمیشہ اسی دل پر قربان کرتے رہتے
تھے۔ اس لئے دیش کی جتنا پر بھی یہ زبردست اثر پڑ گیا ہے
کہ یہ دل باپ کا سچا انویائی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب
یہ گروہ باپ کے اصولوں اور آدرشوں سے ہٹ کر پچھم کا پریمی
اور انویائی بنا تو باپ کے مشن کے پورا ہونے میں وہ دشواریاں

اور خطرے پیدا ہو گئے جو دُنیا کی کوئی دوسری طاقت پیدا نہ کر سکتی تھی آج باپو کے مشن کی کامیابی کے راستے میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

مگر ساری دقتیں اوپری اور کچھ دیری ہیں۔ انسانی زندگی کی آئینک یا روحانی طاقتیں اور آندولن — چاہے ہم انہیں دیکھ سکیں یا نہ دیکھ سکیں — اپنا کام برابر کرتے رہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے گزر جانے کے سو سال بعد ان کا سندیش موجودہ بائبل کے روپ میں دُنیا کے سامنے آیا تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کے پہلے تیرہ سال کی کھینچا تانی اور تین ماری کے بعد ۱۸۲ مسلمان بنائے تھے۔ ان میں سے لگ بھگ سب ہی اپنے جان و مال کی حفاظت کے لئے اپنا وطن چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ مگر اس کے بعد دس سال کے اندر ہی سارا عرب مسلمان ہو گیا اور اگلے تینتیس سال کے بھیترا سلام دُنیا کے کونے کونے تک پہنچ گیا۔ ہاتما بدھ کے جیتے جی ان کے مشن کا اثر ہندستان پر بھی بہت تھوڑا پڑ سکا تھا مگر آج یہ اثر تمام انسانی جیون میں اس طرح گھر کئے ہوئے ہے جس طرح بھوتیک یا مادی دائرے میں بجلی۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر ہم کسی پہنچی ہوئی اور عالیشان روحانی ہستی کی زندگی پر نظر ڈالیں گے، وہ بدھ، محمد، عیسیٰ یا کوئی بھی ہو، تو ہمیں ایک ہی سچائی نظر آئے گی۔ وہ یہ کہ ان جن سیوک کے مشنوں کی کامیابی ان کی زندگی کے مقابلے میں ان کی موت کے بعد ہزار ہا گنی زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ راجے،

ہماراجے، شہنشاہوں کے راج اُن کی موت کے بعد ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو راج یا حکومتیں یہ جن سیوک لوگوں کے دلوں، بھاؤ ناؤں اور جذبوں پر قائم کرتے ہیں وہ اُن کے مرنے کے بعد بھی ہمیشہ پھولتی — پھلتی اور پھیلی رہتی ہیں۔

ہم ان ہاتھاؤں کے مشن کا اندازہ اُن دھرموں یا مذہبوں کی موجودہ حالت سے نہیں لگا سکتے جو آج دنیا میں ان کے کہے پر چلنے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ یہ سب دھرم تو ان نیتک اور روحانی باڑھوں یا سیلابوں کے بھوتک (مادی)، گت چتر (پس اندازے) ہیں جن کی لہریں دُنیا میں پھیل پھیل کر اپنا کام کر چکی ہیں۔ اور آج بھی کہہ رہی ہیں کہ یہ تو وہ کپڑے کھائے ساپنے ہیں جو اپنے ٹوٹنے اور مٹنے کے لئے دوسرے ایسے ہی سیلابوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ سیلاب چاہے راج نیتی کی طرف سے آویں یا روحانیت یا ادھیاتک اکیطرن سے آویں۔ سارے سنسار کی پہنچی ہوئی ہان آتائیں پہلے دن سے لیکر آج تک ہمیشہ ایک ہی روحانی اور نیتک سندیش دُنیا میں پہنچاتی رہی ہیں۔ یہ سندیش 'دوسودھیو کٹب' (انوت انسانی) کا ہے۔ ان کے انھیں سندیشوں نے انسانی دُنیا میں وہ سارے پہلو اور بیج پیدا کئے ہیں جنھیں ہم انسانیت کہتے ہیں۔ انھیں سندیشوں سے وہ اصول اور کارروائیاں، وہ بھلے اور بُرے کے بھید، وہ محبت اور نفرت کے رشتے اور تعلق پیدا ہوئے جن کے گارے اور اینٹوں کی مدد سے ہماری کلہرڈں سبھیتاؤں اور تہذیبوں کی عمارتیں تیار ہو کر کھڑی ہوئی ہیں

اور آج دُنیا میں جتنے بھی راج کاہی آندولن ہیں وہ بڑی راضی خوشی اور کھلے دل کے ساتھ، جان میں یا انجان میں، انھیں سندیشوں کو پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان سب کا بھی ایک ہی سچا دھم ہے۔ 'وسودھیو کٹھ کم، کی استھاپنا، اغوست انسانی کی تکمیل۔' بالوں نے اپنے سے پہلے آنے والے سارے عالیشان پیردوں، پیغمبروں اور فقیروں کی صرف تصدیق ہی نہیں کی ہے، صرف ان سندیشوں کی وحدت (ایکتا) کو ہی روشن نہیں کیا ہے، بلکہ انھوں نے سفار کے سامنے ایک نیا نیتک اور آدمیا تک سادھن لاکر رکھ دیا ہے جو اس کی بڑھوتری کے راستے سے اُن ساری رُکاوتوں اور مصیبتوں کو مستقل طور پر دور کر سکتا ہے، جو اتھاس کے شروع سے ہی اس راستے کی سب سے بڑی دُشواریاں ثابت ہوتی رہی ہیں۔ آج دُنیا ایسے سندیشوں کی پیاسی اور ایسے سادھن کی حاجت میں ہے۔ آج یہ خود ہی پریشان ہے اپنی اُن غلط کارروائیوں کے ہولناک نتیجوں سے جنھوں نے اسے گھائل کر دیا اور جھکھوڑ دیا ہے اور اس کی جان کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ بالوں کا سندیش اس کے لئے مرہم اور امرت ہے۔ ایسے سندیش انسانی اتھاس میں کبھی نظر انداز نہیں ہوئے۔ وہ ادپری اور کچھ دیری ہے رُنی اور لا پرواہی جو آج ہم بالوں کے اصلی آندولن کی طرف سے دیکھ رہے ہیں، کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ ہمیں پورا بھروسہ ہے کہ دُنیا اس کا سواگت کرے گی اور اس کا پورا پورا لالچ اُٹھائے گی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کب ہوگا اور تب تک ہمارا ہندستان کیا کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ باپو کی موت نے چاروں طرف گہرا سندھید پیدا کر دیا ہے۔ اصل میں باپو ہی اپنے جیون میں اس آندولن کے آگوا اور راہ دکھانے والے تھے۔ اس کے نظام میں اُن کا وہی مقام تھا جو سورج کا دُنیا کے نظام میں ہے۔ اُن کی روحانی کشش یا شکتی مختلف اور ایک دوسرے کے خلاف دکھائی پڑنے والی ہستیوں اور جماعتوں کو ایک مرکز پر کھینچ لیتی تھی۔ وہ ہر اعلیٰ اور ادنیٰ انسان سے — چاہے وہ کسی بھی قابلیت اور جماعت کا کیوں نہ ہو — ایک ہی طرح اپنے مقصودوں کو پورا کرنے میں کام لے لیا کرتے تھے۔ اس سورج کے ڈوب جانے سے سارا نظام بکھرا ہوا سا دکھلائی پڑتا ہے۔ مگر سورج کے ڈوبنے سے اُس کے نظام میں کوئی اصلی یا دیر پا تبدیلی توڑی پیدا ہوتی ہے۔ وہ طاقتیں جنہوں نے باپو کو پیدا کیا تھا اپنی جگہ پر ویسی ہی باقی ہیں۔ اس لئے کسی بنیادی انقلاب کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہ وچار کہ جب باپو اپنی زندگی میں خود ہی کچھ نہ کر سکے تو اُن کے اوزیاں بے چارے کیا کر سکیں گے بالکل بے بنیاد اور بے معنی ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ باپو کے اوزکے اور شاندار جیون نے اور اس سے بھی کہیں زیادہ اوزکے اور شاندار بلیدان نے ہمارے ملک پر ہی نہیں بلکہ تمام دُنیا پر اپنی گہری چھاپ ڈال دی ہے۔ جو نیتک اور روحانی طوفان اُن کی وجہ سے پیدا ہوا اُس کی موجیں — چاہے وہ ہمیں دکھلائی نہ پڑیں — دُنیا کی زندگی میں ہلویں لے رہی ہیں۔ یہ سب

جانتے ہیں کہ جہاں دھرتی کے سٹے بارودی سُرنگیں بچھائی جاتی ہیں وہاں ایک چنگاری بھی بہت ہی زبردست نتیجے پیدا کر سکتی ہے۔ چنگاری کا اثر کرنے کا طریقہ قدرت کے قانونوں کے ماتحت ہے۔ قدرت کے قانونوں کی طرح نینکتا یا اخلاق کے قانون بھی اصل اور اٹل ہیں۔ جو روحانی سُرنگ باپو کے آتم بل نے انسانی جیون میں پھیلا دی تھی اُس میں اُن کے بے مثال بلبیدان نے لازمی طور پر اور بھی زیادہ گرمی اور تیزی پیدا کر دی ہے۔ ہوا تیار ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس میں چنگاری آتی کہ دھڑے ہے۔

بہت کچھ ممکن یہی ہے کہ یہ چنگاری اُنھیں لوگوں سے اُڑے گی جنہوں نے نیک نیتی کے ساتھ اپنے جیون کو باپو کے مشن کو پورا کرنے کے لئے بچھاؤ کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے لوگوں کی تعداد ملک میں بہت کم ہے۔ لیکن ستیا گرہ کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ اس میں تعداد کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔ چند ہستیاں ہی، اگر وہ سچی ستیا گرہی ہیں، تو دیش کی بڑی سے بڑی سیوا کر سکتی ہیں اور اسے بڑے سے بڑے خطروں سے بچالیں گی۔ ہم سب دیکھ چکے ہیں کہ باپو نے کیسے اکیلے ایک ستیا گرہی کی حیثیت سے انگریزی حکومت کا مقابلہ کیا اور بہت بڑے پیانے پر کامیابی پائی۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اُنھوں نے اکیلے ہی فرقہ وارانہ طوقان بے کتنا گہرا اور کتنا بڑا اثر ڈالا۔ اس سے زیادہ اُمید اور ہمت دلانے والی بات کیا ہو سکتی ہے؟ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ باپو کی ساری کامیابی کا اصلی کارن

اُن کا گوشت اور ہڈیاں نہ تھیں بلکہ وہی اُصول اور کارروائیاں تھیں جن کی اُنھوں نے ہمیں برابر تیس سال تک اُصولی اور عملی تعلیم دی ہے۔ باپو چلے گئے لیکن اُن کے سارے اُصول اور کام کرنے کے طور طریقے آج بھی زندہ ہیں۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ دُنیا کی جہان آتماں اپنی ساری طاقت اور اونچائی اپنے آپ کو کچھ نیتک اُصولوں کا پابند بنا کر حاصل کرتی ہیں۔ پھر وہ اپنے بڑے بڑے تجربوں کی روشنی میں انھیں اُصولوں کی باریکیاں اور گہرائیاں کھول کر پورے پورے کے ساتھ دُنیا کے سامنے پیش کرتی ہیں اور اپنے پورے ان اُصولوں کی طاقت کے نظارے لوگوں کو دکھلا کر ان کے اندر ان اُصولوں کی اصلیت کا دشواس اور ان کی طاقت کا احساس پیدا کراتی ہیں۔ تو پھر جب صورت یہ ہو اور جب ہماری تعلیم، شکشا، دکشا کیلئے ہماری پرانی تہذیب کا بھنڈار موجود ہی ہو، جب باپو کی تعلیم اور اُن کے بے مثال کارنامے اور کامیاب الذبھو ہماری آنکھوں کے سامنے ہوں، تو پھر ہمیں کمی کس بات کی ہے، گھبراتا کس چیز سے ہے؟ ضرورت محض اس پر تیار ہو جانے کی اور اس پر جُٹ جانے کی ہو۔ اگر باپو کے پریمی اور اوفیائی ایک مہت ہو کر اُن کی آخری وصیت کے پورا کرنے کو اپنا اکیلا مقصد بنالیں تو دُنیا کی کوئی طاقت نہیں ہے کہ جس کا مقابلہ وہ کامیابی کے ساتھ نہ کر سکیں؛ لکشیہ پر پہنچنے کی کوشش ہی ہماری سچھٹا کی اصل سمجھی ہے۔ جن کا یہ دشواس ہے کہ دُنیا کی کھینچا تانیوں کے بیچ آخری اور اصلی صورت میں نیتک اُصول اور طاقتیں ہی انیتک اُصول

اور طاقتوں پر ہمیشہ وجے پاتے ہیں اور جو اس وجے کو سماجی اور قدرتی قانونوں کا نتیجہ سمجھتے ہیں اُن کے لئے اس راستے پر چلنے میں گرنے یا اُٹھنے کا کامیابی یا ناکامیابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اپنے لکشیہ کو سامنے رکھ کر اُس کی طرف بڑھنے کا بھاء اور کوشش۔ یہی اُن کا جیون ہے۔

باپ کے بھکت اس لکشیہ کی طرف بڑھیں یا نہ بڑھیں مگر دیش کی جنتا بہت عرصے تک اس سے بے خبر نہیں رہ سکتی۔ باپ کا مشن ہی اس کی سچی ترقی اور بہتری کا اکیلا ذریعہ ہے۔ دیش کا کوئی خاص دل باپ کا پریمی یا انویائی ہو یا نہ ہو، مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جنتا اُن کی سچی پریمی ہے اور اُن پر جان دیدینے والی ہے۔ باپ جنتا کے دکھ درد کو ہمیشہ کے لئے دور کر دینا چاہتے تھے۔ وہ جنتا کے اندر وہ نینک طاقت پیدا کرنا چاہتے تھے جس سے وہ اپنے دیش کی سچی مالک اور رکشک بن سکے۔ وہ جنتا کے اندر اپنی پُرانی تہذیب کو اُن آدمیات تک اونچائیوں کا انداز پیدا کرنا چاہتے تھے جنہوں نے اسے دُنیا میں ہمیشہ نہرا بھرا اور خوش رکھا ہے۔ اس کا سر ہمیشہ اونچا اُٹھایا ہے اور اسے عزت دی ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ بدوتوں سے یہ ہماری پُرانی تہذیب دُنیا کے کونے کونے کو نیتک اور روحانی غوراک پہنچانے کی سیوا کرتی رہی ہے۔ آج دُنیا اپنے اتہاس کے ایک بہت ہی خطرناک دور سے گزر رہی ہے۔ اس کے بہنے ہوئے سیلاب میں باپ ہمالیہ کی اونچی چوٹی پر کھڑے ہو کر اپنی تیج سے گریزوں سے

دُنیا کی طوفان زدہ برباد قوموں کو اصلی جیون دینے والے کنارے کی راہ دکھا رہے ہیں۔ ہماری پُرانی سمجھتا نے صدیوں سے ڈوبنے والوں کی آہیں اور درد بھری پکاریں سُن کر سنسار کی بہتری اور ہدایت کیلئے اس تیج سے جیوتی کو پیدا کیا ہے۔ ہمارا دیش ہمیشہ سے اس جیوتی کا ماننے والا اور پالنے پوسنے والا رہا ہے۔ آج بھی یہی ہمارا کر تو یہ ہے، یہی ہمارا فرض ہے کہ جس ہائیگیہ میں حصّہ لینے کیلئے بالوں نے اپنے جیون کے بھگاتے کارناموں اور اپنے بلیدان کی تیج سے جیوتی سے ہمیں دعوت دی ہے اُس یگیہ کو کامیاب بناویں۔ یہی ایک اکیلا راستہ ہے ہماری مُکنتی کا، یہی ایک اکیلا راستہ ہے دُنیا کی نجات کا۔

